Sharjeel Ahmed
تعلیم و تربیت
اکتوبر 1995ء

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

ساتواں شمارہ

55 واں سال

تعلیم و تربیت

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر عبدالسلام

ایڈیٹر سعید لخت

اسسٹنٹ ایڈیٹر رضوان ثاقب

اسٹریٹجک ڈیزائننگ سید شوکت اعجاز

سرکولیشن اسسٹنٹ محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پبلشر: ظہیر سلام

پرنٹر عبدالسلام

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60۔ شاہراہ قائد اعظم لاہور

سالانہ قیمت
پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ)
314/0 روپے
مشرقِ وسطیٰ / افریقہ (ہوائی ڈاک سے)
515/- روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے)
715/- روپے
امریکہ / مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے)
735/- روپے

قیمت فی پرچہ 15/- روپے

اکتوبر 1995

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السّلامُ علیکُم

موسم بدل رہا ہے۔ سردیوں کی آمد آمد ہے۔ ایسے موسم کو جس میں ہلکی ہلکی سردی ہو، گلابی جاڑا کہتے ہیں، اور ایسا موسم، میدانی علاقوں میں، اکتوبر سے نومبر تک رہتا ہے۔ شکر ہے چلچلاتی دھوپ سے نجات ملی۔ اب پانچ چھ مہینے آرام سے گزریں گے اور چوٹی سے ایڑی تک پسینا نہیں بہے گا۔

آپ تعلیم و تربیت کی تعریف کرتے ہیں تو ہمارا سیروں خون بڑھتا ہے، اور کام کرنے کا حوصلہ دوگنا ہو جاتا ہے۔ یہ سچّی بات ہے کہ تعلیم و تربیت اُن چند پاکستانی رسالوں میں سے ایک ہے، جنہیں صحیح معنوں میں بچّوں کے معیاری اور مُفید رسالے کہا جاتا ہے۔ اِس بات کا اِعتراف بچّوں کے والِدَین، اساتِذہ اور ماہرینِ تعلیم نے بارہا کیا ہے اور اُنہوں نے تعلیم و تربیت کو تعریفی سَندوں سے نوازا ہے۔ اب ایسے رسالے کو تو ہر گھر میں ہونا چاہیئے تاکہ کوئی پڑھا لکھا بچّہ اِس سے محرُوم نہ رہے۔

تعلیم و تربیت کو گھر گھر پہنچانے کے لِیے ہم نے ایک مُہم شروع کی ہے۔ لیکن ہماری یہ مہم اُسی وقت کام یاب ہو سکتی ہے جب آپ ہماری مدد کریں۔ اپنے رشتے داروں، دوستوں اور ہم جماعتوں کو تعلیم و تربیت پڑھنے کے لِیے دیجیے، اور پھر اُنہیں اِس کا مُستقِل خریدار بننے کے لِیے کہیئے۔ جُوں جُوں رسالے کی اشاعت بڑھے گی، اِس کی دل چسپی اور خوب صورتی میں اِضافہ ہو گا۔

اِس شمارے میں

اداریہ		1
بارہ من کی دھوبن (کہانی)	محمد یونس حسرت	2
کتاب میں تتلی (کہانی)	نظر زیدی	9
ایک تتلی (نظم)	حفیظ الرحمان احسن	13
ذرا سی بھول (کہانی)	فوزیہ طاہرہ	14
جہاد (درسِ قرآن)	ڈاکٹر عبدالرؤف	18
کر بھلا، ہو بھلا (سنہری چڑیا)	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	19
قلمی دوست (کہانی)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	21
لیاقت علی خان (نظم)	امان اللہ نیر شوکت	25
شکاری پرندے (مضمون)	س۔ل	26
بلا عنوان (کہانی)	نعیم مشتاق نوی	29
سندر بن کا آدم خور (کہانی)	عبدالرشید فاروقی	36
خزاں آگئی ہے (نظم)	تاج انصاری	39
آموں کی پیٹی (کہانی)	حنا خیری	40
آیئے مسکرائیں (لطائف)		45
علمی آزمائش		46
باتیں بڑوں کی		47
بتایئے		48
آپ بھی لکھیے		49
آپ کا خط ملا		54
شکار اور شکاری (کہانی)	سلیم خاں گمی	57
گیزر (قدرت کے عجوبے)	س۔ل	64

سرورق: بارہ من کی دھوبن

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ شارع بن بادیس لاہور فون: 6361309-6361310 6278815-6278816

بارہ من کی دھوبن

محمد یونس حسرت

"جیدی!"

ڈائمنڈ جوبلی سرکس کے مسخرے 'لمبو شاہ' نے سرکس بوائے 'جیدی' کو آواز دی مگر جیدی نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"جیدی! ارے او جیدی!" لمبو شاہ نے دوبارہ خاصے زور سے چیخ کر کہا تو جیدی ہڑبڑا کر چونکا اور کہنے لگا "اوہ! انکل، آپ ہیں۔ معاف کرنا۔ میں نے آپ کی آواز سنی نہیں۔ میں پڑھ رہا تھا"۔

"ہوں" لمبو شاہ نے کہا" تو پڑھ رہے تھے تم۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ کیا پڑھ رہے تھے"۔

یہ کہتے ہوئے لمبو شاہ نے جیدی کے ہاتھ سے کتاب لے لی اور اسے اِدھر اُدھر سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا "تو یہ بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمہیں جاسوسی اور سراغ رسانی کی کہانیاں بہت پسند ہیں"۔

ہاں، انکل "جیدی نے کہا" بلکہ میرا جی تو چاہتا ہے کہ میں خود بھی سراغ رساں بنوں، مجرموں کا پیچھا کروں، اُن کا سراغ لگاؤں اور اُنہیں گرفتار کراؤں"۔

لمبو شاہ ہنس کر بولا "مجرموں کا سراغ لگانا اور اُنہیں گرفتار کرانا تو بعد کی بات ہے۔ اِس وقت تو تم میرے میک اَپ بکس کا سراغ لگاؤ۔ میں نے اِدھر اُدھر بہت دیکھا مگر کہیں نہیں ملا"۔

"جو آپ کا حکم، انکل" جیدی نے کہا اور کتاب واپس لینے کے لیے لمبو شاہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں، جیدی" لمبو شاہ نے کتاب والا ہاتھ پرے کرتے ہوئے کہا "یہ اُس وقت تک میرے پاس رہے گی اور میں اِس کی پوری پوری حفاظت کروں گا۔ اور ہاں، جیدی۔"

"فرمائیے، انکل؟"

"میڈم بلبل جان کو ناراض نہ کرنا.........."

"وہ بارہ من کی دھوبن ....؟" جیدی مسکرا کر بولا۔

"ہاں" لمبو شاہ نے کہا "تمہاری اِسی بات سے وہ تم سے ناراض ہے کہ تم نے مذاق میں اُسے بارہ من کی دھوبن کہہ دیا تھا۔ اب جیسے بھی ہو سکے، تمہیں اُسے ناراض ہونے کا موقع نہیں دینا چاہیے، ورنہ وہ اور کچھ نہیں تو اپنے بھاری بھرکم جسم سے تمہیں کچل کر رکھ دے گی اور تمہاری ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی"۔

"انکل، میں تو پوری اِحتیاط کرتا ہوں" جیدی نے کہا "بلکہ میری کوشش تو ہوتی ہے کہ اُسے ناراض ہونے کا کوئی موقع نہ دوں۔ مگر وہ تو اُس وقت سے ہی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے جب سے اُستاد فیروز یہاں سے گئے ہیں اور وہ اُن کی جگہ مُلازِم ہوئی ہے۔ اُس کا خوف مجھ پر کچھ اِس بری طرح چھایا رہتا ہے کہ میں کوئی کام بھی ٹھیک سے نہیں کر سکتا۔ خود اِس سرکس کے مالک، میاں صاحِب، اُس کی اِس عادت سے بے زار ہیں۔ وہ دن میں پتا نہیں کتنی بار اُن کے پاس جا کر میری اُلٹی سیدھی شکایتیں کرتی ہے"۔

"میں جانتا ہوں" لمبو شاہ نے کہا "مگر بُلبُل جان کی بار بار کی شکایتوں سے میاں صاحب شاید تم سے بھی بدگمان ہونے لگے ہیں۔ اگر بات بڑھ گئی اور اُنھوں نے تمہیں سرکس سے نکال دیا تو میں بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میاں صاحِب یہاں کسی قِسم کی گڑبڑ نہیں چاہتے، اِس لیے تمہیں ایک ایک قدم اِحتیاط سے اٹھانا چاہیے۔ ایک ایک بات سوچ سمجھ کر مُنہ سے نکالنی چاہیے"۔

مگر جیدی کے ایسے بھلے نصیب کہاں۔

وہ لمبو شاہ کے میک اپ بکس کو ڈھونڈ کر اور اُسے لمبو شاہ کے حوالے کر کے واپس آ رہا تھا کہ سرکس کے مالک میاں صاحب نے اُسے آواز دی۔ وہ اپنے اُس دفتر کے دروازے میں کھڑے تھے جو دفتر کے عِلاوہ ٹکٹ گھر اور اُن کی رِہائش کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ جیدی نے دیکھا کہ اُن کے پیچھے سرکس کی وہ بارہ من کی دھوبن، میڈم بُلبُل جان، بھی کھڑی ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے میاں صاحِب کی طرف بڑھا اور اُنہیں جُھک کر سلام کر کے کہنے لگا "جی، میاں صاحِب۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"ہاں" میاں صاحِب نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا "آخر مجھے کتنی بار تمہیں یہ بات سمجھانی پڑے گی کہ تمہیں میڈم بُلبُل جان کے ساتھ ادب اور تمیز سے پیش آنا چاہیے"۔

"میں نے تو کوئی بدتمیزی نہیں کی، جناب" جیدی نے کہا "بالکل ایمان داری سے کہتا ہوں، جناب۔ میں نے بالکل کوئی بدتمیزی اور گستاخی نہیں کی میڈم کے ساتھ"۔

اِس سے پہلے کہ میاں صاحب جیدی کی بات کے جواب میں کچھ کہتے، میڈم بُلبُل جان یعنی وہ بارہ من کی دھوبن غصے سے تلملاتے اور گلے کی پوری طاقت سے چیختے ہوئے بولی "یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اِس کی مسکین صورت پر نہ جائیں، میاں صاحِب۔ یہ پرلے درجے کا شیطان ہے"۔

اور اِس کے ساتھ ہی وہ مشین گن کے فائر کی طرح

جیدی پر تابڑ توڑ اِلزامات کی بارش کرنے لگی: اِس نے فلاں موقع پر میرے بارے میں یہ کہا۔ اِس نے فلاں شخص سے میری یہ شکایت کی۔ اِس نے میرے خِلاف فلاں فلاں کے کان بھرے۔ اِس نے یہ کہا۔ اِس نے وہ کہا۔ اِس نے یہ کہا۔ اِس نے وہ کہا۔

یہ ساری وہ باتیں تھیں جو جیدی نے ہنسی دِل لگی میں سرکس کے لوگوں سے مختلف موقعوں پر کی تھیں۔ اِن باتوں میں میڈم بُلبُل جان کی توہین اور بے عِزّتی کا کوئی پہلو نہ تھا مگر میڈم نے اِن تمام باتوں کو اِس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا تھا کہ وہ شِکایتیں ہی شِکایتیں بن گئی تھیں۔ جیدی نے اپنی صفائی پیش کرنے کی بہت کوشش کی مگر میاں صاحِب نے اُس کی باتوں پر بالکُل کان نہ دھرا اور کہنے لگے:

"چلو، بھاگو یہاں سے۔ اور اگر دوبارہ مجھے تمہاری شِکایت ملی تو تمہاری ہمیشہ کے لیے چھُٹّی ہو جائے گی"۔

جیدی بوجھل بوجھل دِل کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔ شام کے شو کے بعد جب وہ اور لمبُو شاہ سونے کی تیّاری کر رہے تھے تو اُس سے رہا نہ گیا اور وہ کہنے لگا "انکل، بتائیے، میں کیا کروں؟ میں تو اُس بارہ من کی دھوبن سے پرے رہنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اِس سے بھی بات نہیں بن رہی۔ اُس نے پہلے دن ہی سے مجھے اپنی نفرت اور غصّے کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ اور میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ اُس نے ایک طرح سے میاں صاحِب کے دفتر پر بھی قبضہ جمالیا ہے۔ جب دیکھو وہ وہاں میرے خِلاف کوئی نہ کوئی شِکایت لے کر موجود ہوتی ہے۔ میاں صاحِب وہاں ہوں تب بھی موجود ہوتی ہے اور میاں صاحِب نہ ہوں تب بھی۔ اور کاہے کے لِیے؟ جیدی کی شکایت کرنے کے لیے۔ آپ ہی بتائیے انکل، میں کیا کروں؟"

لمبُو شاہ نے تھوڑی دیر خاموشی سے کچھ سوچا، پھر اپنے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا "بھئی، میری سمجھ میں تو یہ مُعاملہ بالکُل نہیں آرہا"۔ پھر وہ ہنس کر بولا "اور ویسے بھی جاسوس اور سُراغ رساں تو تم ہو، میں نہیں۔ اِس لِیے تمہیں خود ہی اِس گُتھّی کو سُلجھانا پڑے گا"۔

جیدی نے لمبو شاہ کے اِس مذاق پر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی کوشش کی مگر اُس کا دل اندر سے اِتنا بُجھا ہوا اور اُداس تھا کہ وہ مسکرانے میں بھی ناکام رہا۔ اُس نے اپنی جاسوسی کی کہانیوں کی کتاب سنبھالی اور ایک کہانی کے مُطالعے میں کھو گیا۔

اگلے تین دن جیدی اپنی اس کوشش میں کام یاب رہا کہ اُس کا سامنا میڈم بُلبُل جان سے نہ ہونے پائے۔ مگر یہ صورت ہمیشہ کے لِیے تو قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک سہ پہر جب کہ پہلے شو کے نہ ہونے کی وجہ سے سرکس کے لوگ فارِغ تھے، جیدی ایک خیمے میں بمبُو نام کے ہاتھی کے بچّے کی مالِش کر رہا تھا۔ ہاتھی کا یہ بچّہ جیدی سے بہت مانوس تھا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھا کہ میڈم بُلبُل جان آندھی طُوفان کی طرح خیمے میں داخِل ہوئی، اور چھڑی لہراتے ہوئے زور

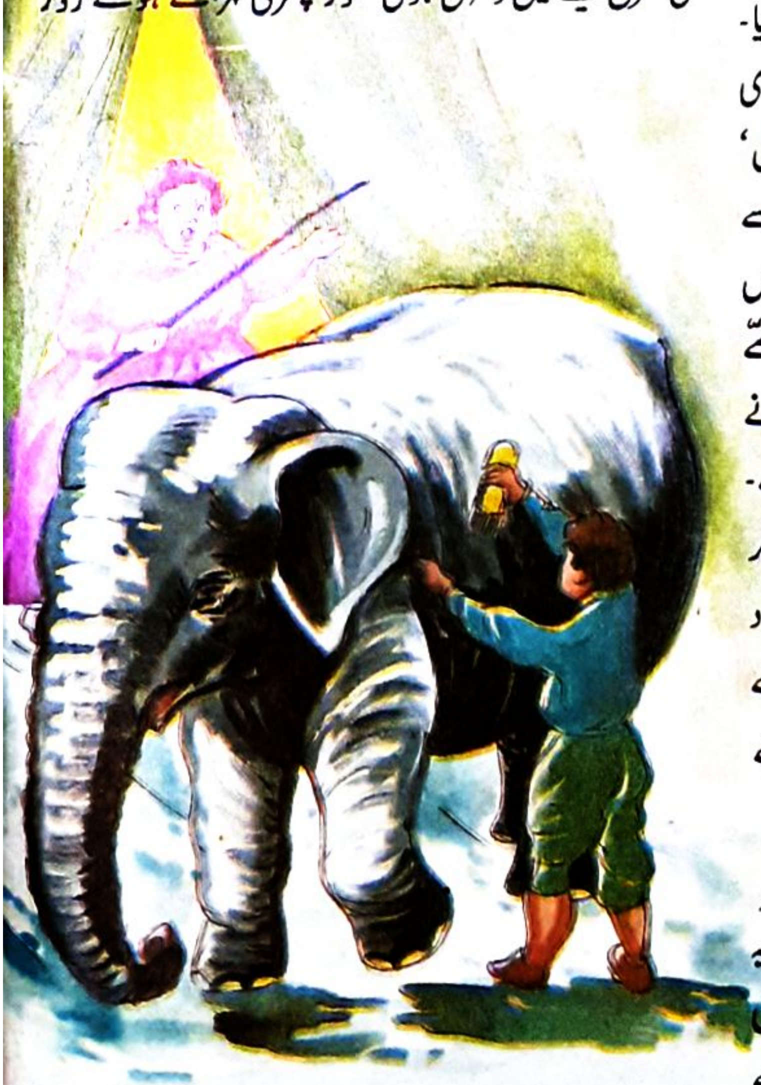

سے چیخی "ہٹ جاؤ لڑکے، میرے راستے سے!"

جیدی تو اُس کی چھڑی کا نشانہ بننے سے بال بال بچ گیا مگر بد قسمتی سے وہ چھڑی ببو کے جا لگی۔ وہ بھلا چھڑی کی مار کو خاموشی سے کیسے برداشت کرتا۔ وہ گھوما اور اُس عورت کی طرف بڑھا جو وزن میں اُس سے زیادہ نہیں، تو کم بھی نہ تھی۔

"تم! تمہاری یہ جرأت؟" میڈم بلبل جان چیخی اور اُس نے ہاتھی کو پیٹنا شروع کر دیا۔

ببو کو پٹتے دیکھ کر جیدی کو غصّہ آگیا۔ اُس نے چھڑی میڈم بلبل جان کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور پھر اُسے اپنے گھٹنے پر مار کر، دو ٹکڑے کرکے، ایک طرف پھینک دیا۔

"اچھا!" میڈم بلبل جان غصّے سے پھنکاری "اب دیکھو میں تمھیں تمہاری اِس حرکت کا کیسا مزہ چکھاتی ہوں۔ ابھی میاں صاحب سے جا کر کہتی ہوں کہ وہ تمھیں اِسی وقت سرکس سے نکال دیں۔ میں ایسی توہین اور بے عزّتی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی"۔

جیدی نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ بارہ من کی دھوبن اُس کی باتوں پر دھیان دیے بغیر غصّے سے پھنکارتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

مگر اِس بار جیدی نے یہ طے کر لیا تھا کہ میڈم بلبل جان کو اُس کے خلاف نہیں، بلکہ اُسے میڈیم بلبل جان کے خلاف شکایت کرنی چاہیے۔

اُس نے ببو کے بدن پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں ابھی تھوڑی دیر میں آیا۔ واپس آکر تمہاری مالش کروں گا۔"

اور یہ کہہ کر اُس نے سرکس کے مالک، میاں صاحب، کے دفتر کا رُخ کیا۔ اُس نے تو ایک طرح سے میاں صاحب کے دفتر تک پہنچنے کے لیے دوڑ لگائی تھی مگر اِس دوڑ کے باوجود اُس کی قسمت شاید اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ دفتر کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اُسے میڈم بلبل جان کا بھاری بھرکم جسم، لہراتے ہوئے سُرخ لباس کے ساتھ، دروازے کے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اُس کے قدم ایک دم یوں رُک گئے جیسے کسی نے اُسے زمین میں گاڑ دیا ہو۔

پہلی بار وہ میڈم بلبل جان کے خلاف ایک جائز شکایت لے کر میاں صاحب کے پاس آیا تھا مگر یہاں بھی میڈم اُسے مات دے کر اُس سے پہلے میاں صاحب کے دفتر میں پہنچ گئی تھی۔ اُس نے میڈم بلبل جان کی قیمتی چھڑی کو دو ٹکڑے کیا تھا اور وہ اِس قصور پر اُسے سرکس سے نکلوا سکتی تھی۔ اُس نے ایک سرد آہ بھری اور دفتر کے باہر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ میڈم بلبل جان دفتر سے باہر آئے یا سرکس کے مالک میاں صاحب آواز دے کر اُسے اندر بلائیں۔

یہ انتظار خاصا لمبا تھا، مگر اِس لمبے انتظار کے باوجود دونوں میں سے کوئی بات نہ ہوئی۔ نہ میڈم بلبل جان دفتر سے باہر آئی اور نہ میاں صاحب نے آواز دے کر اُسے اندر بلایا۔

"ہاں، بھائی" آخر کار پیچھے سے ایک آواز آئی "اب کیا بات ہوگئی؟"

یہ سرکس کے مالک، میاں صاحب، کی آواز تھی جو ابھی ابھی باہر سے آئے تھے۔ جیدی نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو میاں صاحب نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور کہا "بس، بس! میں جانتا ہوں کہ میڈم بلبل جان دفتر کے اندر تمہاری شکایت کرنے کے لیے میرے انتظار میں بیٹھی ہے۔ ہے ناں؟"

"جی، جناب" جیدی نے حوصلہ کرکے کہا "میں نے کوئی ایک گھنٹا پہلے اُنھیں دفتر کے اندر جاتے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے اُنھیں نیند آگئی ہو اور وہ آپ کا انتظار کرتے کرتے سو گئی ہوں"۔

"ہو سکتا ہے" میاں صاحب کہنے لگے "ہو سکتا ہے کہ میرا انتظار کرتے کرتے اُسے نیند آگئی ہو۔ مگر اتنی دیر تک تو اُس نے کبھی انتظار نہیں کیا، اِس سے پہلے۔ خیر، ہم اُسے چند منٹ اور انتظار کرنے دیں گے۔ اتنی دیر میں تم جو کچھ

کہنا چاہتے ہو، کہو۔ اور میرا خیال ہے، اِس کا تمہیں حق بھی ہے"۔

جیدی نے خوش ہو کر ساری بات بیان کر ڈالی۔

"ٹھیک" میاں صاحب بولے "اب دیکھنا یہ ہے کہ میڈم اِس بارے میں کیا کہتی ہے۔ میں اندر جاکر اُس سے بات کرتا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ جانا نہیں۔"

میاں صاحب دفتر میں داخل ہوئے اور چند لمحوں بعد ہی گھبرائے ہوئے باہر نکل کر کہنے لگے:

"کسی نے میری تجوری توڑ کر اُس میں سے تمام رقم نکال لی ہے۔ پچھلے ایک ہفتے کی ساری آمدنی اُس میں تھی۔ میں لُٹ گیا ہُوں! تباہ ہو گیا ہُوں!"

میاں صاحب کو چیختے چلاتے دیکھ کر سرکس کے لوگ بھاگے بھاگے آئے۔ لبُو شاہ نے میاں صاحب سے پُوچھا "میاں صاحب، کیا کسی نے کسی شخص کو دفتر کے اندر جاتے دیکھا تھا؟"

"کوئی اندر نہیں گیا" میاں صاحب بولے "سوائے میڈم بُلبُل جان کے، اور اُسے جیدی نے اندر جاتے دیکھا تھا"۔

پھر جیسے وہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگے "عجیب بات ہے! وہ اندر گئی تھی تو وہاں سے کہاں غائب ہو گئی؟ جیدی، تمہیں یقین ہے کہ وہ دفتر سے واپس نہیں گئی؟ اچھی طرح غور کرو اور سوچو۔ کیا تم سارا وقت یہیں رہے ہو؟"

"جی، جناب" جیدی نے جواب دیا "میں تو یہاں سے ہِلا تک نہیں۔ میں نے اُنہیں اندر جاتے دیکھا تھا۔ اُنہوں نے سُرخ لباس پہن رکھا تھا۔ میں نے اُنہیں دفتر سے باہر نکلتے ہوئے بالکل نہیں دیکھا۔ اِس کا مجھے پُورا یقین ہے۔ ہو سکتا ہے وہ پچھلی کھڑکی کے راستے باہر نکل گئی ہوں"۔

لبُو شاہ آگے بڑھا اور اپنا ہاتھ جیدی کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولا "تم کیا انٹ شنٹ ہانک رہے ہو، جیدی۔ اُس کھڑکی میں سے تو میں نہیں گزر سکتا، میڈم بُلبُل جان کیسے گزرے گی؟"

پھر اُس نے میاں صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میاں صاحب، بہتر ہو گا پولیس کو بُلوا لیا جائے"۔

"اور میڈم بُلبُل جان کو بھی" جیدی نے کہا۔

عین اُسی لمحے وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کے پیچھے ایک ہلچل سی ہوئی اور ساتھ ہی میڈم بلبل جان کی آواز گونجی "کون مجھے بُلاتا ہے؟"

پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے آگے بڑھی۔ لوگ اُس کے بھاری بھرکم جسم کو گزرنے کا راستہ دینے کے لیے اِدھر اُدھر ہوتے رہے۔

"میڈم" میاں صاحب نے اُس سے مُخاطِب ہوتے ہوئے کہا "میں لُٹ گیا ہوں۔ کسی نے میری تجوری توڑ کر پچھلے ایک ہفتے کی وہ ساری رقم نکال لی ہے جو اُس میں رکھی ہوئی تھی۔ یہ جیدی کہتا ہے کہ اِس نے کوئی ایک گھنٹا پہلے آپ کو اندر جاتے دیکھا تھا۔ مگر یہ اِس بات کی بھی قسم کھاتا ہے کہ اِس نے آپ کو باہر نکلتے نہیں دیکھا"۔

ایک لمحے کے لیے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"تو یہ بات ہے!" میڈم بُلبُل جان کی آواز گونجی "تو پھر میں آپ کو یہ بات بتانا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ میں ساری سہ پہر اپنے خیمے میں رہی ہوں۔ ساری سہ پہر رہی ہوں"۔

جیدی کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا۔ یہ تو بڑی خوف ناک بات تھی، ایسی خوف ناک کہ اُس نے کبھی اِس کا تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے تمام لوگوں کی نظریں اُسی پر گڑ گئی ہیں۔ وہ سب یقیناً اُسے جھوٹا سمجھ رہے تھے۔ مایوسی اور گھبراہٹ کے عالَم میں وہ مُڑا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہُوا۔ لبُو شاہ نے اُسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ اُس سے بچ کر بھاگا اور بھاگتا ہی چلا گیا۔

"اُسے جانے دو، لبُو شاہ" میاں صاحِب کی آواز سُنائی دی "جیدی بے وقوف تو ہوسکتا ہے اور شاید اُس نے جھوٹ بولا ہو، مگر وہ چور نہیں۔ ہرگز نہیں"۔

پھر اُنھوں نے اپنے ایک آدمی کو تھانے کی طرف روانہ کیا اور اِس کے بعد خاموشی سے اپنے دفتر کے اندر چلے گئے۔

جیدی اندھا دُھند بھاگتا ہوا میاں صاحِب کے دفتر کے پچھواڑے، کھڑکی تک، کیسے پہنچ گیا، اِس کا جواب کوئی اور تو کیا، وہ خود بھی نہیں دے سکتا تھا۔ مگر اُس کھڑکی کے قریب پہنچ کر جب وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہُوا تو زمین پر نِگاہ پڑتے ہی اُس کا دِل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ کھڑکی کے پاس نرم نرم مٹّی پر قدموں کے کئی نشانات تھے۔

اُسی لمحے جیدی کے اندر کا سُراغ رساں جاگ اُٹھا۔ وہ دھڑکتے دِل کے ساتھ اُن نِشانات کا سُراغ لگاتا ہُوا آگے بڑھنے لگا۔ نشانات کہیں کہیں مَدّھم ہو جاتے، مگر جیدی اُن کا سُراغ لگاتا ہُوا آگے بڑھتا رہا اور سرکس سے آدھ میل دُور نِکل گیا۔ یہاں اُس نے، جھاڑیوں کے درمیان، ایک شخص کو حرکت کرتے دیکھا۔

"ارے میاں!" جیدی نے اُسے آواز دی۔ "تم نے اِدھر سے کسی کو............"

لیکن جیدی کی بات اُس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئی۔ وہ شخص جھاڑیوں میں سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کپڑوں کا بنڈل اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ اور پستول کی نال جیدی کی طرف تھی!

جیدی نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ لمبے قد اور دُبلے پتلے جِسم کا شخص تھا اور اُس کے دائیں گال پر زخم کا نِشان تھا۔ جیدی اُس کو دیکھتے ہی ساری بات سمجھ گیا۔ یہی شخص چور تھا اور یہی میڈم جان کا لباس پہن کر میاں صاحِب کے دفتر میں داخِل ہُوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں جو بنڈل تھا، اُس میں یقیناً میڈم بلبل جان کا وہی لباس تھا جو میڈم نے اُس وقت پہن رکھا تھا جب وہ ببُو ہاتھی والے خیمے میں آئی تھی۔ یقینی طور پر اِس شخص نے میاں صاحِب کی تجوری سے چُرائی ہوئی رقم کو میڈم بلبل جان کے لباس میں لپیٹ رکھا تھا۔

نہ جانے اُس وقت جیدی میں اِتنا حوصلہ کہاں سے آگیا۔ اُس نے للکار کر کہا "تم بچ کر نہیں جاسکتے۔ دونوں بچ کر نہیں جاسکتے۔ ابھی کوئی دم میں دُوسرے لوگ آجائیں گے۔ جان کی سلامَتی چاہتے ہو تو پستول پھینک دو!"

"اپنا یہ چھوٹا سا مُنہ بند رکھو، لڑکے!" دُبلے آدمی نے غصّے سے کہا "تم اگرچہ نہیں جانتے، مگر تم ہمارے کام آتے رہے ہو۔ تمھاری وجہ سے ہمیں میاں صاحِب کے دفتر میں آنے جانے کا موقع ملتا رہا ہے اور اِس طرح ہمیں تجوری کھولنے میں آسانی ہوگئی۔ اب تم ہمارے اور بھی کام آؤ گے۔ شاباش! یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ، اور اپنی زبان بند رکھو۔ زبان کھولی تو پستول کی گولی تمھارے بھیجے کے پار ہوگی۔ سمجھے؟"

مگر جیدی ڈرنے کی بجائے کچھ اور بِپھر گیا۔ اب اُسے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ میڈم نے اُس کے خلاف شکایت کرنے کو میاں صاحِب کے دفتر میں بار بار آنے جانے کا بہانہ بنا لیا تھا اور اِس بہانے کی آڑ میں تجوری سے رقم پار کرنے کی صورت پیدا کرلی تھی۔ اُس نے غصّے سے بِپھر کر چھلانگ لگائی

اور اپنے بُوٹ کی نوک سے اُس شخص کی پِنڈلی کی ہڈّی پر پُورے زور سے ضرب لگائی۔

اِس ضرب کا وُہی نتیجہ نکلا جس کی جیدی کو توقُّع تھی۔ ایک زور کی درد بھری چیخ اُس شخص کے ہونٹوں سے نکلی۔ اُس کا پستول اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کچھ دُور پتھروں پر جاگرا اور گرتے ہی اپنے آپ چل گیا۔ جیدی نے پھر چھلانگ لگائی اور اُس شخص سے لِپٹ گیا۔

اُس شخص کے ساتھ جیدی کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ مگر وہ اُس سے جھاڑ کی طرح لپٹ گیا تھا اور اُسے اپنے آپ کو چھُڑانے اور وہاں سے بھاگ جانے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

وہ اِسی طرح اُس شخص سے اُلجھا ہُوا تھا کہ پولیس کے سپاہی آپہنچے اور اُنھوں نے اُس شخص کو گرفتار کرلیا۔ اِس طرح اُس شخص کا معاملہ اپنے انجام کو پہنچ گیا جس نے چند لمحوں کے لِیے میڈم بُلبُل جان کا بھیس بھرا تھا۔

اصل میں یہ شخص میڈم بُلبل جان کا شوہر تھا۔ اِن دونوں کے خِلاف کئی ایسے ثبوت پولیس کے سامنے آئے جو اُن کو قانون کے شکنجے میں کسنے اور جیل کی مضبوط سَلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لِیے کافی تھے۔ اُن دونوں نے اپنی اِسکیم بڑی ہوشیاری سے بنائی تھی۔ مگر جیدی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اُنھوں نے، اپنی اِسکیم پر عمل کرنے کے لِیے، اُسے قربانی کا بکرا بنانے کا جتن کیوں کیا تھا!

"میں بتاتا ہوں، جیدی" لبُّو شاہ نے کہا "یہ تو ایک یقینی بات تھی کہ تمھارے خِلاف شِکایتوں سے میاں صاحِب نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور لیا ہوگا، مگر یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ وہ تمھیں پسند کرتے ہیں۔ چُناں چہ وہ میڈم بلبل جان کی شکایتوں کو توجّہ سے تو سُنتے تھے، مگر اُنھیں نظرانداز کردیتے تھے۔ میڈم بُلبُل جان بھی صِرف شِکایتیں ہی کرتی تھی کیوں کہ اِن شکایتوں کے پردے میں اُن دونوں میاں بیوی کا اصل مقصد تو میاں صاحِب کی رقم اُڑانا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ شکایتوں کا یہ سِلسِلہ ہمیشہ تو جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اگر واقعی مقصد تمھاری شکایت ہی ہوتا تو جس طرح تم نے میڈم کی چھڑی دو ٹکڑے کی تھی، اِسی طرح وہ بھی تمھارے دو ٹکڑے کراکر ہی دم لیتی۔ مگر اصل کھیل تو کچھ اور تھا، اور میڈم بُلبل جان اور اُس کے شوہر نے وہی کھیل کھیلا۔ ویسے ایک بات ہے، جیدی۔ تم نے اپنا سُراغ رسانی کا کمال ٹھیک وقت پر دکھایا۔ مجھے اُمید ہے کہ آگے چل کر تمھارے جوہر اور بھی کھُلیں گے اور تم بڑے ہوکر ایک اچھّے سُراغ رساں ثابت ہوگے"۔

"نہ انکل، نہ" جیدی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "میں سرکس بُوائے ہی ٹھیک ہُوں"۔

کتاب میں تتلی

سید نظر زیدی

مقبول نے آنکھیں جھپک کر غور سے دیکھا۔ وہ تتلی ہی تھی، مگر اتنی بڑی کہ اُسے دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ اُس کا قد لمبے تڑنگے آدمی کے برابر تھا۔ وہ اپنے بڑے بڑے پر یُوں ہلا رہی تھی جیسے حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ جس چیز نے مقبول کو خاص طور سے ڈرایا' وہ اُس کی آنکھیں تھیں۔ انگارے کی طرح دہکتی ہوئی' لال لال آنکھیں۔ وہ اپنی اِن خوف ناک آنکھوں سے اُسے گھورے جا رہی تھی۔

مقبول پُھرتی کے ساتھ کُرسی سے اُٹھا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ لیکن تتلی اُس سے بھی زیادہ پُھرتی کے ساتھ کُود کر اُس کے سامنے آ گئی اور بہت اُونچی آواز میں بولی" ہُونہہ! تو تم بھاگ کر جان بچانا چاہتے ہو۔ لیکن شریر اور بے رحم لڑکے! اب تم بچ کر نہیں جا سکتے۔ تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں تمھیں گرفتار کرتی ہوں۔ چلو' سیدھی طرح میرے آگے آگے۔ اور یاد رکھو' بھاگنے کی کوشش کی تو بہت بُرا انجام ہوگا!"

تتلی کی یہ بات سُن کر مقبول کو یُوں لگا جیسے اُس کے ہاتھ پاؤں بے جان ہو گئے ہوں۔ وہ مرے مرے قدموں سے اُس طرف چلنے لگا جس طرف تتلی نے اِشارہ کیا تھا۔ وہ اُسے ہانکتی ہُوئی ایک بہت بڑے محل میں لے گئی اور دھکّا دے کر ایک بہت بڑی تتلی کے سامنے پھینک دیا۔ "لیجیے' ملکہ صاحبہ۔ یہ رہا وہ مجرم جس نے میری بہن کو قتل کیا ہے"۔

"اچھا تو یہ ہے وہ شریر اور ظالم لڑکا جو تمھاری بہن کا قاتل ہے۔ ہمارے پاس پہلے بھی اِس کی بہت سی شکایتیں آئی ہیں۔ اچھا ہُوا تم اِسے پکڑ لائیں۔ اب ہم اِس کو پوری پوری سزا دیں گے۔ تیار ہو جا شریر لڑکے' اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے!"

مقبول نے ڈرتے ڈرتے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ ایک بہت ہی ڈراونی تتلی کالے رنگ کے ایسے تخت پر بیٹھی تھی جو بھونرے کی شکل کا تھا۔ غصّے کی وجہ سے اُس کی آنکھوں سے شعلے نِکل رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر مقبول کی تو جان ہی نِکل گئی۔ اُس نے چاہا کہ ہاتھ جوڑ کر مُعافی مانگے اور وعدہ کرے کہ آیندہ کسی تتلی کو نہ ستائے گا' لیکن اِس کوشش میں کام یاب نہ ہُوا۔

ذرا دیر رُک کر تتلی پہلے سے زیادہ اُونچی آواز میں بولی "لے جاؤ اِسے، اور اُس کنُوئیں میں پھینک دو جس میں سانپ اور بچھّو بھرے ہوئے ہیں۔ وہ ڈسیں گے تو اِسے معلوم ہوگا کہ کم زوروں کو ستانا کتنا بڑا گُناہ ہے۔ اِس کے علاوہ ایک کام یہ کرو کہ تتلیوں کی دُنیا میں مُنادی کرادو کہ اِس بُرے لڑکے کی کوٹھی کے لان میں کوئی تتلی نہ جائے۔ اِس کے لان کے پودے پھولوں سے خالی رہیں گے اور درختوں پر کوئی پھل بھی نہ لگے گا۔ جاؤ، اِسے لے جاؤ!"

تتلی کی بات ختم ہوتے ہی ڈراونی شکلوں والی تین چار تتلیاں مقبول کی طرف بڑھیں۔ اُن کی لال لال آنکھوں سے شُعلے نِکل رہے تھے۔ اُنہیں اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو مقبول کے مُنہ سے چیخ نِکل گئی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اُن سے مُعافی مانگنے لگا، لیکن تتلیاں اپنے لمبے لمبے پَر پھڑپھڑاتی اور لمبی لمبی خوف ناک مُونچھیں پھڑکاتی ہوئی، اُس کے بالکُل پاس آگئیں۔ اُن کے نوکیلے پیر اُس کے بدن میں چُبھنے لگے۔ اُسے سخت تکلیف ہوئی اور وہ گلے کی پوری قوّت سے چِلاّنے لگا۔

اِس تکلیف سے اُسے اُس وقت نجات ملی جب باجی نے اُسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ اُس کا پورا بدن پسینے میں بھیگ گیا تھا اور وہ یوں کانپ رہا تھا جیسے سردی کا بُخار چڑھ گیا ہو۔ باجی نے تسلّی دیتے ہوئے کہا "ہوش میں آؤ، مقبول۔ کیا کوئی ڈراونا خواب دیکھ رہے تھے؟"

"ایں؟ خواب؟ ہاں باجی، شاید میں خواب ہی دیکھ رہا تھا۔ ایسا خوفناک خواب تھا باجی کہ اگر آپ مجھے جگا نہ دیتیں تو شاید میرے دِل کی حرکت بند ہوجاتی۔ توبہ! توبہ! میرے اللہ! میری توبہ! میں پکّا وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ تتلیوں کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں"۔

"کیا تم خواب میں تتلیاں دیکھ رہے تھے؟ پھر تو واقعی بڑے بہادر ہو جو تتلیاں دیکھ کر ڈر گئے" یہ کہہ کر باجی نے مسکراتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"آپ تتلیاں کہہ رہی ہیں، وہ تو چڑیلیں تھیں، چڑیلیں۔ آپ سے بھی بڑی۔ اُن کی لال لال آنکھوں سے آگ کے شُعلے نکل رہے تھے اور وہ مجھے سانپوں اور بچھّوؤں سے بھرے ہوئے کنُوئیں میں پھینک دینا چاہتی تھیں" مقبول نے کہا۔ وہ ابھی تک کانپ رہا تھا۔

باجی اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں "یہ تو واقعی بہُت ڈراونا خواب تھا۔ اچھّا، یہ تو بتاؤ، تم نے تتلیاں تو نہیں پکڑی تھیں آج؟"

"باجی، وہ تو میں روز ہی پکڑتا ہوں۔ ویسے آج صبح میں نے ایک بہُت ہی خوب صُورت تتلی پکڑی تھی اور اُسے اپنی کتاب میں رکھ دیا تھا" مقبول نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اب اُس کا ڈر کچھ کم ہوگیا تھا۔

"اچھّا، اب سچّے دِل سے توبہ کرو کہ آیندہ ایسا گُناہ نہیں کرو گے" باجی نے کہا "یاد رکھو! تتلیاں کو مارنا بہُت بڑا گُناہ ہے"۔

"کیا واقعی تتلیاں پکڑنا گُناہ ہے، باجی؟" مقبول نے سوال کیا۔

"خواب میں یہی تو تمھیں بتایا گیا ہے۔ جو تتلیاں تمھیں چڑیلوں جیسی نظر آئیں اور جنھوں نے تمھیں سانپوں اور بچھوؤں سے بھرے ہوئے کنُوئیں میں گرانا چاہا، وہ وہی تھیں جنھیں تم نے پکڑا تھا اور مار ڈالا تھا۔ میرے پیارے بھائی، یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ اللہ پاک اچھّے کاموں کا انعام دیتا ہے اور اُس نے اِنسانوں کے بُرے کاموں کی سزا مُقرّر کی ہے۔ اور اِس انعام یا سزا کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آدمی کی زِندگی اِس دُنیا میں ہی اچھّی یا بُری بن جاتی ہے"۔

"آپ کا مطلب ہے، اچھّے کام کرنے والے خوب امیر ہو جاتے ہیں اور بُرے کام کرنے والوں کو غریب کردیا جاتا ہے؟" مقبول نے پُوچھا۔

"نہیں، یہ بات نہیں۔ اِنسانوں کے غریب یا امیر ہونے

کا تعلّق زیادہ تر اُن کی قابلیّت سے ہے۔ جو عِلم حاصِل کرتے یا محنت سے کوئی ہُنر سیکھتے ہیں، وہ خوش حال ہو جاتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے، اُن کی زندگی پریشانیوں میں کٹتی ہے۔ میرا مطلب اصل میں یہ ہے کہ بھلائی اور نیکی کے کام کرنے والوں کو سچّی خوشی اور اصلی اِطمینان حاصل ہوتا ہے۔ بُرائی کے راستے پر چلنے والوں کو یہ نِعمتیں نہیں ملتیں۔ اور اِس اِنعام کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اچھّے لوگوں کو بہُت اچھّے خواب دکھائے جاتے ہیں اور بُرے لوگ ایسے ڈراونے خواب دیکھتے ہیں جیسا تم نے دیکھا تھا۔ اصل میں اُن کے گُناہ اور بُرے کام ڈراونی شکلوں میں اُنہیں دکھائے جاتے ہیں"۔

"بِالکُل ٹھیک۔ میں یہ بات اچھّی طرح سمجھ گیا۔ اگر میں تِتلیوں کا دُشمن نہ ہوتا تو وہ مجھے ایسی ڈراونی شکلوں میں نظر نہ آتیں اور سانپوں، بچھّوؤں کے بھرے ہوئے کنُوئیں میں پھینک دینے کی دھمکیاں نہ دیتیں۔ لیکن باجی، پھر بھی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ہمارے لان کو اُجاڑ دینے کا کیوں کہ رہی تھیں۔ کیا فرشتوں اور جِنوں کی طرح اللہ پاک نے اُنہیں بھی خاص طاقتیں دی ہیں؟"

"نہیں، میرے پیارے بھائی۔ تِتلیوں میں ایسی کوئی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ کسی لان کو اُجاڑ دیں یا اُس میں ڈھیروں پھول کِھلا دیں۔ پھر بھی پھول کِھلنے یا نہ کِھلنے کی ایک بات ایسی ضرور ہے جس کا تعلّق پیاری پیاری ننھّی مُنّی تِتلیوں سے ہے۔ وہ بات اِس طرح ہے کہ جس طرح اللہ پاک نے جان داروں کے جوڑے بنائے ہیں، اِسی طرح درختوں اور پودوں کے بھی جوڑے ہوتے ہیں۔ اُن میں کچھ نَر یعنی مرد اور کچھ مادہ یعنی عورت ہوتے ہیں، اور اُنہیں پھل پھول اُگانے کے قابِل بنانے میں تِتلیاں اور شہد کی مکھّیاں وغیرہ خاص کام کرتی ہیں۔ وہ جب کسی درخت یا پودے کے پھول کا رس چُوستی ہیں تو اُن کے پیروں پر پھول کی ایک خاص قِسم کی چیز لگ جاتی ہے جسے زرِگُل کہتے ہیں۔ جب وہ پہلی جگہ سے اُڑ کر دوسرے درخت یا پودے پر بیٹھتی ہیں تو وہ چیز یعنی زرِگُل دوسرے درخت یا پودے تک پہنچ جاتی ہے اور پھل پھول اُگنے کا سبب بنتی ہے"۔

"اچھّا، میں سمجھ گیا۔ پھول نہ اُگانے کی بات اُس تتلی

نے اِسی وجہ سے کی تھی" مقبول نے کہا۔

"بالکل۔ اگر وہ ہمارے لان میں آنا چھوڑ دیں تو ہمارے پودوں پر ایک بھی پھول نہ کِھلے"۔

"لیکن باجی، وہ ناراض تو مجھ سے اب بھی ہوں گی۔ سانپوں اور بچھوؤں سے بھرے ہوئے کنوئیں میں گرنے سے تو میں اِس لیے بچ گیا کہ میری آنکھ کھُل گئی اور خواب ختم ہوگیا۔ اُن کا غصّہ اور نفرت تو ختم نہیں ہوئی ناں؟"

"ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن اِسے دُور کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ تم سچّے دل سے توبہ کرو اور پکّا اِرادہ کرلو کہ آیندہ تتلیاں نہیں پکڑو گے"۔

"یہ اِرادہ تو باجی، میں نے پہلے ہی کرلیا ہے۔ بلکہ یہ اِرادہ بھی کرلیا ہے کہ اپنی کتابوں میں جو تتلیاں رکھی ہیں، اُن سب کو نکال کر پھینک دوں گا"۔

"تو پھر تتلیوں کا غصّہ بھی ختم ہو جائے گا اور ہمارے لان میں پہلے کی طرح رنگ برنگ، پیارے پیارے، پھول کِھلتے رہیں گے۔"

"اور میں ڈراونے خوابوں کی جگہ اچھے اچھے خواب دیکھا کروں گا" مقبول نے کہا۔

"اُمّید تو یہی ہے۔ ویسے یہ خاص اِنعام حاصِل کرنے کے لیے کچھ اور اچھے کام کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سب کا بھلا چاہنا، سب کی عزّت اور مدد کرنا، اپنے خیالات کو پاک رکھنا یعنی غصّے، لالچ اور حسد وغیرہ سے بچنا" باجی نے کہا۔

"تو باجی جان، یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اِن شاء اللہ میں ایسا ہی کروں گا" مقبول نے خوش ہوکر کہا "لیجیے، تتلیاں تو میں اپنی کتابوں سے ابھی نکال دیتا ہوں۔ ایسا کرنے سے مجھے تھوڑا سا رنج تو ضرور ہوگا، کیوں کہ یہ تتلیاں بہت پیاری پیاری ہیں اور اِنہیں پکڑنے کے لیے مجھے بہت محنت کرنی پڑی تھی"۔

"یہ تو ہے، لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اِس اچھے کام کا انعام بھی بہت بڑا ملے گا" باجی نے کہا۔ وہ اُس وقت بہت خوش نظر آرہی تھیں۔

مقبول اُس وقت یوں محسوس کررہا تھا جیسے زمین آسمان کے درمیان لٹک گیا ہے۔ کبھی اِس یقین سے اُس کا دِل خوشی سے بھر جاتا تھا کہ توبہ کرنے کے بعد میں اللہ پاک کی رحمت کا حق دار بن گیا ہوں۔ مجھے بڑے بڑے اِنعام ملیں گے۔ اور کبھی شک اور بے یقینی دماغ میں آگھُستی۔

باجی اُسے شاباش دے کر چلی گئیں تو وہ کافی دیر اُسی جگہ بیٹھا اُلٹی سیدھی باتیں سوچتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھا اور وہ ساری مَری ہوئی تتلیاں کتابوں سے نکال کر لان میں پھینک دیں جو اُس نے بہت محنت کرکے پکڑی تھیں اور بڑے شوق سے کتابوں میں رکھی تھیں۔

اُس رات وہ سویا تو اُس نے خواب میں اپنے آپ کو پھر اُسی لمبی چوڑی تتلی کے سامنے کھڑا پایا جس نے اُسے سانپوں اور بچھوؤں سے بھرے ہوئے کنوئیں میں گرا دینے کا حکم دیا تھا۔ اُسے دیکھ کر اُس کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اب میری جان نہ بچے گی۔ لیکن اُس کی توقّع کے خِلاف تتلی نے بہت محبّت سے اُس کی طرف دیکھا اور میٹھی آواز میں بولی:

"اچھے بیٹے، ڈرو نہیں۔ اب میں نے تمھیں سزا دینے کے لیے نہیں، اِنعام دینے کے لیے بُلایا ہے۔ جب تم نے سچّے دل سے یہ اِرادہ کرلیا کہ تتلیوں کو نہ ستاؤ گے تو اللہ پاک نے تمھارے سب گُناہ مُعاف کردیے اور ہم نے تمھیں اپنی دُنیا کا شہزادہ بنالیا لو، یہ تاج پہنو"۔

بات ختم کرکے تتلی نے ایک چمک دار، سُنہری تاج، اُس کی طرف بڑھایا اور اِس کے ساتھ ہی خواب ختم ہوگیا۔ نیند سے جاگ کر اُس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ خواب جہاں سے ٹوٹا ہے، وہیں سے پھر شروع ہو جائے۔ اُس کی یہ خواہش تو پوری نہ ہوئی، لیکن یہ یقین پُختہ ہوگیا کہ اب وہ ایسے ہی اچھے اچھے خواب دیکھا کرے گا۔ باجی کی باتیں اُسے بِالکُل ٹھیک لگ رہی تھیں۔ خوشی سے اُس کا چہرہ پھول کی طرح کِھل گیا۔

حفیظ الرحمٰن احسن

ایک تِتلی

اُڑتی اُڑتی کہیں سے آئی ہے — ایک تتلی کہیں سے آئی ہے
رُوح بے چین ہے بہت اِس کی — اُڑتے اُڑتے کبھی نہیں تھکتی
سیدھا اُڑنا اِسے نہیں آتا — سیدھا چلنا اِسے نہیں بھاتا
دائیں مُڑتی ہے اور کبھی بائیں — جیسے رستے میں موڑ آجائیں
کبھی اُوپر گئی، کبھی نیچے — کبھی آگے بڑھی، کبھی پیچھے
ایک لمحے میں دُور جا پہنچی — دیکھتے دیکھتے پھر آپہنچی
کبھی اِس پھول پر، کبھی اُس پر — کہیں ٹکتی نہیں ہے وہ پل بھر
چُوستی پھر رہی ہے کب سے رس — دیکھیے، تھک کے کب کرے وہ بس
پھر وہ نظروں سے ہوگئی اوجھل — شاید اب آئے گی نظر وہ کل

میں یہ سمجھا کہ کھو گئی تتلی
چھُپ کے پتّوں میں سو گئی تتلی

ذرا سی بھول

فوزیہ طاہرہ

اسلام آباد کے اِس نئے اور سب سے بڑے شاپنگ پلازا میں ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سارا شہر ہی اُمڈ آیا ہو۔ زینت اور عبداللہ ہر شے کو بڑی حیرانی سے دیکھ رہے تھے، حال آں کہ وہ بیسیوں مرتبہ لاہور کے انار کلی اور لبرٹی جیسے بازاروں میں شاپنگ کر چکے تھے۔ لیکن اِس شاپنگ پلازا کی، جسے عوامی مرکز کا نام دیا گیا ہے، بات ہی کچھ اور تھی۔

پانچ منزلہ اِس شاپنگ پلازا کے اندر داخل ہوتے ہی اُنھیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ یورپ یا امریکا کے کسی شہر میں آگئے ہوں۔ ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں اور دُکانوں کو اِتنی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا کہ لوگ اُنھیں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

گراؤنڈ فلور یعنی نیچے کی منزل میں یوٹیلٹی اِسٹور تھا اور اُس کے دائیں جانب بچّوں کے کھلونوں کی دُکان تھی۔ زینت ہر کھلونا اُٹھا اُٹھا کر یوں دیکھ رہی تھی جیسے اُس نے پہلے کبھی کوئی کھلونا نہ دیکھا ہو۔

وحید انصاری بھی اپنے بچّوں کے کِھلے ہوئے چہرے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ وہ بیوی بچّوں کے ساتھ چند دنوں کے لیے اپنے بھائی، سعید انصاری، کے گھر راولپنڈی آئے ہوئے تھے، اور چوں کہ اُنھیں 9 بجے کی فلائٹ سے کراچی جانا تھا، اِس لیے اُنھوں نے بچّوں کو ہدایت کی تھی کہ سارا شاپنگ پلازا ایک گھنٹے کے اندر اندر دیکھ لیں۔ شاپنگ کے لیے پھر کسی دن آجائیں گے۔ لہٰذا بیگم وحید، زینت اور عبداللہ کو لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر لے گئیں۔ اِس منزل میں ریڈی میڈ کپڑوں کے عِلاوہ نت نئے ڈیزائن کے قالین، بہت خوب صورت اور قیمتی جوتے، ٹی وی سیٹ، فرج، الیکٹرونکس کا سامان، گھڑیاں اور نئے نئے ڈیزائن کے چشمے غرض کہ دنیا جہان کی شے موجود تھی۔

وحید انصاری اور اُن کی بیگم قالینوں کی دکان پر قالینوں کے بھاؤ معلوم کرنے لگے۔ عبداللہ کی نظر دھوپ کے چشموں پر جم گئی اور وہ دکان دار سے مختلف چشمے لے کر دیکھنے لگا۔ زینت گھڑیوں کی دکان پر جا کھڑی ہوئی اور شوکیس میں رکھی ہوئی گھڑیاں دیکھنے لگی۔ اُس کے ابّو، وحید انصاری، نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پانچویں جماعت کا اِمتحان اچھّے نمبروں سے پاس کرے گی تو وہ اُسے اِنعام میں خوب صورت سی گھڑی دیں گے۔ وہ ہر گھڑی کو غور سے دیکھ رہی تھی تاکہ جب وہ پانچویں جماعت میں اوّل پوزیشن حاصل کرے گی تو یہاں سے اپنی پسند کی گھڑی خریدے گی۔

دکان کی سیلز گرل بہت خوش اخلاق تھی۔ اگرچہ وہ بھانپ چکی تھی کہ زینت کو کچھ خریدنا نہیں ہے، اِس کے باوجود وہ شوکیس میں سے گھڑیاں نکال نکال کر اُسے دکھانے لگی۔ کبھی ڈائل والی گھڑی تو کبھی ڈیجیٹل نمبروں والی۔

زینت کے بس میں ہوتا تو ساری آج ہی خرید کر لے جاتی۔

بچّوں کو دل ہی دل میں غصّہ آرہا تھا کہ بھلا ابّاجان کو بھی آج ہی کراچی جانا تھا۔ اگرچہ اُنہیں کل واپس آجانا تھا، لیکن جلدی گھر جانے کی وجہ سے بچّے صحیح طور پر اِس شاپنگ پلازا کو دیکھ نہیں پارہے تھے۔

عبداللہ رنگ برنگ چشموں کو آنکھوں پر سجا سجا کر خوش ہو رہا تھا۔ زینت کی چچی، بیگم سعید، زیورات کی دکان پر کھڑی یوں ہی، خواہ مخواہ زیوروں کے بھاؤ معلوم کر رہی تھیں۔ زینت نے کنکھیوں (کَن اَکھیوں) سے اپنے امّی ابّو کو دیکھا جو ابھی تک قالین والی دکان پر ہی کھڑے تھے۔ پھر اُس نے باری باری ہر گھڑی اپنی کلائی پر باندھ کر دیکھی۔ سیلز گرل اُس کی معصومانہ حرکتوں سے بہُت خوش ہو رہی تھی۔ دونوں تھوڑے سے ہی عرصے میں ایک دوسرے سے ایسی بے تکلّف ہوگئیں جیسے بہُت پہلے سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ سیلز گرل کو زینت اپنی چھوٹی بہن جیسی معلوم ہو رہی تھی۔

"باجی، آپ نوکری کیوں کرتی ہیں"؟ زینت نے سُرخ ڈائل والی گھڑی دائیں کلائی پر باندھتے ہوئے سیلز گرل سے پُوچھا۔

"مجبوری ہے ناں۔ میرے والد اب اِس دُنیا میں نہیں ہیں۔ ایک ماں ہے اور ایک چھوٹی بہن۔ بڑا بھائی بھی کوئی نہیں ہے۔ اِس لیے گھر کا خرچ چلانے کے لیے مجھے کام کرنا پڑتا ہے" سیلز گرل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"باجی، آپ کتنی جماعتیں پڑھی ہوئی ہیں؟" زینت نے ایک اور گولڈن ڈائل والی گھڑی بائیں بازو پر باندھتے ہوئے پوچھا۔ اُس نے بائیں بازو میں گولڈن چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں اور گھڑی کے لیے جگہ نہ تھی۔ پھر بھی اُس نے چوڑیوں کو زبردستی اِدھر اُدھر کرکے درمیان میں جگہ بنا ہی لی۔

سیلز گرل بولی "میں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ جی تو چاہتا تھا اور پڑھوں لیکن ......" اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی، کیوں کہ اِس دوران میں تین چار گاہک گھڑیوں والے شوکیس کے اِرد گِرد کھڑے ہو کر گھڑیاں دیکھنے لگے تھے۔ زینت کو غصّہ تو بہُت آیا، لیکن پی گئی۔ پتا نہیں وہ وہ کب تک یوں ہی گھڑیاں دیکھتی رہتی کہ عبداللہ اپنے بڑے پن کا رُعب جھاڑتا ہوا، اُس کے سر پر آن دھمکا اور ایک ہی جگہ سے نہ ہٹنے پر اُسے ڈانٹنے لگا۔ حال آں کہ وہ خود بھی کافی دیر سے ایک ہی دکان پر کھڑا چشموں سے دل بہلا رہا تھا۔

زینت نے مُنہ بسُورتے ہوئے، دائیں کلائی سے سرخ ڈائل والی گھڑی اُتار کر شوکیس پر رکھی اور سیلز گرل کو خدا حافظ کہہ کر، ہاتھ ہلاتی ہوئی، چل دی۔ زینت اور عبداللہ کی خواہش تھی کہ وہ ایلی ویٹر (بجلی کی آٹومیٹک سیڑھیوں) کے ذریعے نیچے کی منزل پر جائیں۔ لیکن سکیورٹی اِسٹاف نے بتایا کہ یہاں آنے والوں نے اِن سیڑھیوں کو اِتنی بے دردی سے اِستعمال کیا کہ وہ خراب ہوگئی ہیں۔ مجبوراً اِن سب کو لِفٹ کے ذریعے ہی نیچے آنا پڑا۔

اِسلام آباد سے راول پنڈی کا راستہ پَون گھنٹے کا ہے۔ اِس لیے سب افراتفری کے عالَم میں تھے۔ وحید انصاری کو اِحساس تھا کہ بچّے صحیح طور پر شاپنگ پلازا نہیں دیکھ سکے۔ اِس لیے اُنھوں نے وعدہ کیا کہ وہ کراچی سے واپس آنے کے بعد اُنہیں دوبارہ یہاں لائیں گے اور شاپنگ بھی کروائیں گے۔ یہ سُن کر زینت اور عبداللہ کا غصّہ کچھ کم ہوگیا۔

گھر پہنچتے ہی وحید انصاری نے اپنا بریف کیس اُٹھایا اور ایئرپورٹ روانہ ہوگئے۔ زینت اور عبداللہ کو شکر پڑیاں کی سیر کا اِتنا مزہ نہیں آیا تھا جتنا آج عوامی مرکز دیکھ کر آیا۔ وہ لاہور سے تو یہ ٹھان کر چلے تھے کہ اِسلام آباد کا عوامی مرکز ضرور دیکھیں گے۔ اگرچہ یوٹیلٹی اِسٹور کے سِوا ہر دکان پر چیزیں اِتنی مہنگی تھیں کہ توبہ ہی بھلی۔ دوسری منزل پر نہایت خوب صورت ریستوران تھا، لیکن یہاں بھی کھانے کی ہر شے کی قیمت دوگنی تھی۔

ریستوران کا خیال آتے ہی بچّوں کی بھوک چمک

اُٹھی' اور وہ کھانے کی میز کی طرف دوڑے۔ زینت کی والدہ اور اُس کی چچی' بیگم سعید' ڈائننگ ٹیبل پر برتن رکھ رہی تھیں اور ساتھ ہی شاپنگ پلازا کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کر رہی تھیں۔ اُنھوں نے مزے مزے کے کھانے پکا رکھے تھے۔ زینت تو' موٹی موٹی آنکھیں مٹکا مٹکا کر' شامی کبابوں پر ہاتھ صاف کر رہی تھی' لیکن عبداللہ جانے کیوں کھانے سے ہاتھ روکے بیٹھا تھا۔

"بھیّا' تمھیں تو سب سے زیادہ بھوک لگی تھی۔ اب کیا ہوا؟" زینت کی اِس بات پر اُس کی امّی اور چچی چونک کر عبداللہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

"تم بڑی میسنی ہو۔ زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں" عبداللہ تو جیسے بھرا بیٹھا تھا ایک دم پھٹ پڑا۔

اب تو بیگم سعید کو بھی تشویش ہوئی۔ اُنھیں خیال گزرا کہ کہیں اُن کی مہمان نوازی میں تو کوئی کمی نہیں رہ گئی۔ اُنھوں نے دوسری ڈِشیں عبداللہ کے آگے رکھتے ہوئے اُسے کھانے کے لیے کہا۔

"عبداللہ بیٹا' کچھ اور کھانا چاہتے ہو تو بتادو" بیگم سعید نے بڑی شفقت سے کہا۔

عبداللہ کی امّی بھی حیران تھیں کہ کچھ ہی دیر پہلے تو یہ بہت خوش خوش دکھائی دے رہا تھا' کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی اِس کے موڈ کو کیا ہو گیا۔ اور خاص طور سے وہ زینت کو تو یوں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے کھا ہی جائے گا۔ اُس کی نظر بار بار زینت کی چوڑیوں والی کلائی پر پڑ رہی تھی۔

"بھیّا' میں نے تمھیں کیا کہا ہے؟ دیکھیے' امّی جان...." زینت نے اپنی امّی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اِحتجاج کیا۔

"تم تو ہو ہی امّی جان کی چہیتی۔ مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ شاپنگ پلازا سے شاپنگ نہیں کرنی' پھر..... پھر..... امّی جان نے تمھیں یہ گولڈن گھڑی کیوں خرید کر دی؟" عبداللہ اُس کی بائیں کلائی سختی سے پکڑتے ہوئے بولا۔

"ہائے! میری کلائی" زینت درد سے چِلّائی۔ لیکن ساتھ ہی وہ اور اُس کی امّی عبداللہ کی بات سُن کر بھونچکا رہ گئیں۔

"ارے! واقعی!" بے اِختیار بیگم سعید کی زبان سے نکلا۔ زینت کی بائیں کلائی پر گولڈن گھڑی بندھی ہوئی تھی اور گولڈن چوڑیوں میں اِس طرح چھُپی ہوئی تھی کہ مُشکل سے نظر آ رہی تھی۔

اب زینت کو یاد آیا کہ اُس نے گھڑیوں کی دکان پر دائیں کلائی پر سُرخ ڈائل والی گھڑی باندھی تھی اور بائیں کلائی پر گولڈن گھڑی۔ اُس نے دائیں کلائی کی گھڑی تو سیلز گرل کو واپس کر دی تھی لیکن چوڑیوں والی کلائی سے گھڑی اُتارنا بھول گئی تھی۔

"اُف! یہ کیا ہو گیا!" زینت کے مُنہ سے نکلا۔ اُس نے اپنی امّی کو پریشان دیکھ کر اُنھیں ساری بات بتائی اور کہا کہ افراتفری میں اُسے یہ گھڑی کانچ کی چوڑیوں میں دکھائی نہ دی۔ بے چاری یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ سیلز گرل سوچتی ہوگی کہ شاید میں یہ گھڑی چُرا کر لے گئی ہوں۔

اب رات کے 10 بج چکے تھے۔ زینت نے گھڑی کلائی

سے اُتاری اور اِحتیاط سے الماری میں رکھ دی۔ نہ تو اُس کی امّی گاڑی چلا سکتی تھیں اور نہ اُس کی چچی بیگم سعید۔ اُس کے چچا سعید انصاری اُن دِنوں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ دن چڑھتے ہی اُن کے ساتھ اِسلام آباد جاکر گھڑی واپس کر آتی۔

"بھیّا' مجھے تو بہُت ڈر لگ رہا ہے۔ تم نے دیکھا تھا ناں' وہاں ٹی وی بھی لگا ہوا تھا' جس میں ہر آنے جانے والے کی تصویر آرہی تھی" زینت نے عبدُاللہ سے کہا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ شاپنگ پلازا کے لوگوں نے ٹی وی پر تمہیں گھڑی پہنتے ہوئے دیکھ لیا ہو" عبداللہ نے زینت کو ڈراتے ہوئے کہا۔

"ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟ اگر ہمارے یہاں پولیس آگئی تو؟ بھیّا' میں کوئی چور تو نہیں ہوں۔ بس جلدی میں کلائی سے گھڑی اُتارنا بھول گئی تھی۔" زینت بُری طرح روہانسی ہورہی تھی۔ اُس کی امّی نے اُسے تسلّی دی کہ اُس کے ابّو کے آتے ہی ہم شاپنگ پلازا جائیں گے اور سیلز گرل سے مُعافی مانگیں گے۔وہ بھی پریشان ہوگی۔

دوسرے دن زینت کو یوں لگ رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ شام ہونے کو نہیں آرہی تھی۔ آخر دعائیں مانگ مانگ کر فلائٹ کا ٹائم قریب آیا۔ زینت اور عبداللہ کے کان دروازے پر ہی لگے ہوئے تھے کہ جوں ہی ٹیکسی کے رُکنے کی آواز آئے' وہ فوراً اپنے والِد کو صورتِ حال سے آگاہ کردیں۔ اُسی وقت پورچ میں ٹیکسی رُکنے کی آواز آئی۔ دونوں بچّے دوڑتے ہوئے باہر گئے۔ زینت تو اپنے ابّو کی ٹانگوں سے لِپٹ گئی اور ایک ہی سانس میں سارا قصّہ سُناڈالا۔

وحید انصاری اپنی بیٹی کی پریشانی کو بھانپ چکے تھے۔ انُھوں نے اپنے آرام کا خیال نہ کیا' پورچ سے گاڑی نکالی اور عبداللہ اور زینت کو لے کر اسلام آباد روانہ ہوگئے۔ لیکن عوامی مرکز میں پہنچ کر وہ دوسری منزل پر گئے تو گھڑیوں کی دکان پر سیلز گرل کہیں نظر نہ آئی۔ وحید انصاری نے دکان کے مالِک سے سیلز گرل کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ کوثر نام کی اُس سیلز گرل نے اِیمان داری سے کام نہیں کیا تھا' اِس لِیے اُسے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔

وحید انصاری نے دکان کے مالک سے اپنا تعارُف کرایا اور پھر اُسے 'گھڑی واپس کرکے' سارا قصّہ الف سے یے تک کہ سُنایا۔ وہ ایک رحم دل اِنسان تھا۔ وہ اُسی وقت وحید انصاری کے ساتھ کوثر کے گھر گیا۔ وہ راولپنڈی کے قریب ایک کالونی' سیّد پور' میں رہتی تھی۔ اُن کی گاڑی کوثر کے گھر کے قریب جاکر رُکی تو بستی کے بچّے باہر نکل آئے اور لمبی سفید گاڑی میں بیٹھے زینت اور عبداللہ کو حیرت سے دیکھنے لگے۔

کوثر کا مکان بہُت چھوٹا اور بوسیدہ سا تھا۔ وحید انصاری نے دروازے پر دستک دی تو کوثر کی ماں باہر نکلی۔ وہ خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ دکان کے مالک سیٹھ نورَ دین نے اُسے سلام کیا اور پھر گھڑی کے بارے میں ساری بات بتائی اور کہا کہ وہ کوثر کو کل دُکان پر بھیج دے۔

زینت اور عبداللہ مکان کے اندر داخل ہوئے تو کوثر اُنھیں دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئی۔ اور جب زینت نے اُسے گولڈن گھڑی کے بارے میں بتایا تو اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسُو اُمڈ آئے۔ اُسے یقین ہوگیا کہ خدا نیک اور اِیمان دار لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے۔

شام گہری ہورہی تھی۔ زینت اور عبداللہ نے کوثر سے اِجازت چاہی اور یہ مُختصَر سا قافلہ واپَس اپنے گھر کو سِدھارا۔

زینت آج بہُت خوش تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اُس کے سر سے بہُت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔ وحید انصاری زینت کے چہرے پر کھیلتی ہوئی خوشی کو دیکھ رہے تھے۔ انُھوں نے مسکرا کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور پھر بڑھ کر اُس کا ماتھا چُوم لیا۔

بچوں کے لیے درسِ قرآن

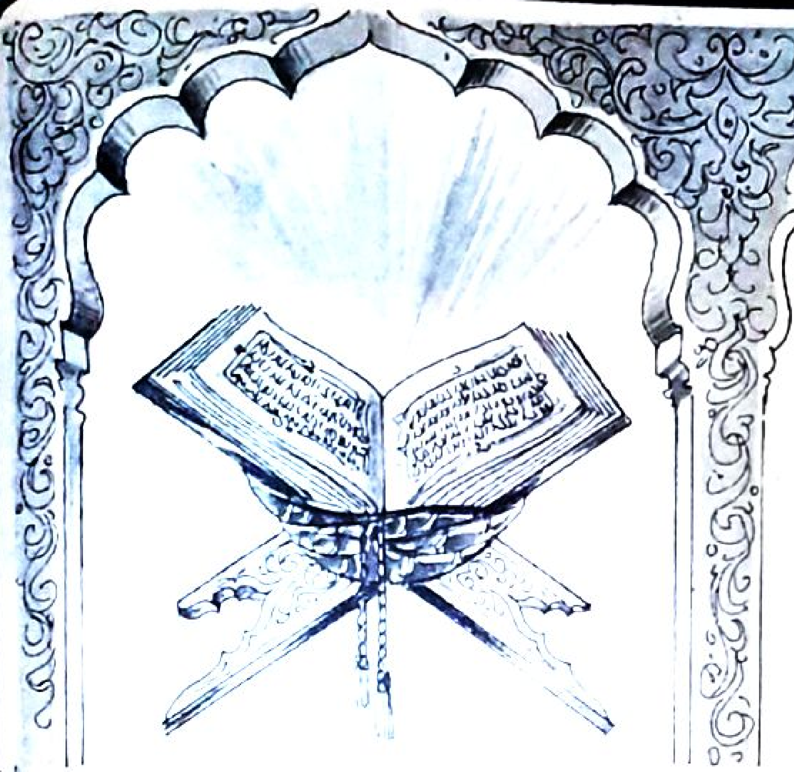

درسِ قرآن

جہاد

بچوں کے لیے درسِ قرآن میں ہمارا آج کا موضوع ہے: جہاد۔ موضوع کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ہم نے قرآنِ حکیم کی بائیسویں سُورہ کی آیت نمبر 78 کے اِبتدائی تین الفاظ چُنے ہیں:

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ   بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ

(اللہ کے راستے میں جہاد کرو!)

جہاد کا معنی ہے: محنت کرنا، مشقّت کرنا، کوشش کرنا، ظلم و ستم کے خلاف ڈٹ جانا وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب کچھ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے کرنا۔ جہاد اِسلام کا بہت اہم عقیدہ ہے۔ اِس کی تین اقسام ہیں:۔

1- زبان اور قلم سے جہاد: یعنی کسی قسم کی بُرائی کے خلاف بھلے طریقے سے کچھ کہنا، کچھ لکھنا، وغیرہ تاکہ لوگ بُری بات اور بُرے عمل سے باز آجائیں۔

2- مال و دولت سے جہاد: جہاد کرنے والوں کے لیے مالی اِمداد اور ساز و سامان فراہم کرنا۔ یہ بھی جہاد کی ایک قسم ہے۔

3- جسم، اُسلحہ وغیرہ سے جہاد: اللہ کی راہ میں جہاد میں اپنے جسم اور اسلحہ وغیرہ سمیت شامل ہو جانا۔ صاف ظاہر ہے جہاد کی یہ قسم سب سے بہتر ہے۔

اِس وقت کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، فلپین اور فلسطین میں جہاد زوروں پر ہے۔ اِس جہاد میں کئی مسلمان ملکوں کے غیُور اور بہادُر مجاہد شامل ہو رہے ہیں۔

چھوٹے بچے پہلی دو قسموں کے جہاد میں تو آسانی سے شامل ہوسکتے ہیں۔ مگر شاید عمر کے اِس دور میں جسمانی جہاد میں شامل ہونا اُن کے لیے قدرے دُشوار ہو۔ بہرکیف، جوان ہو کر وہ اپنی ہمّت، اِستطاعت اور ضرورت کے مطابق جہاد کی اِس تیسری اور اصل صورت میں شامل ہوسکتے ہیں۔ ظلم و ستم اور حق تلفی و ناانصافی کے خلاف محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ڈٹ جانا انسانی زندگی کا بہت مُہذّب عمل ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دانائی کی باتیں

کر بھلا، ہو گا بھلا

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سنہری چڑیا نے کہا:

پیارے بچّو، میں آج آپ کو جو کہانی سُنانا چاہوں گی، اِس کا موضوع ہے :

کر بھلا ہو گا بھلا، اَنت بھلے کا بھلا

یہ کہاوت مشہور بھی ہے اور سچّی بھی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مشرقی پنجاب کے شہر امرتسر میں ملک یوسف نامی ایک بزرگ رہتے تھے۔ اُن کی آپ بیتی اُن کی زبانی سُنیے :

14 اگست 1947ء کی رات امرتسر کے مسلمانوں کے لیے قیامت کی رات تھی۔ شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ ہندو اور سِکھ غُنڈے پولیس اور فوج کی مدد سے مسلمانوں کے گھروں کو نذرِ آتش کر رہے اور نہتّے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا رہے تھے۔

یہ رات شبِ قدر تھی۔ ہمارے محلّے کُوچہ رنگ ریزاں کے لوگ مسجدوں اور گھروں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے میں مصروف تھے، جب کہ کچھ نوجوان ہندوؤں اور سِکھوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔

صبح ہوئی تو ظالم بلوائیوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ہم اپنا محلّہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ گولیوں کی بارش میں بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں، بوڑھے اور بچّے بچتے بچاتے ایک دوسرے محلّے 'ڈیگراں' میں پہنچ گئے۔ لیکن بہت سی عورتیں، بچّے اور مرد شہید ہو گئے اور بیسیوں لڑکیوں کو سِکھوں نے اِغوا کر لیا۔

محلہ ڈیگراں میں سینکڑوں مسلمان پناہ گزیں تھے اور بچھڑنے اور شہید ہونے والوں کے رشتے دار زار و قطار رو رہے تھے۔ سہ پہر کو ایک ہندو لیڈر چند فوجی جوانوں کو لے کر محلّے میں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا۔

ہم نے اُس سے کہا کہ جو محلّہ ہم چھوڑ کر آئے ہیں، اُس میں ہمارے کچھ لوگ رہ گئے تھے، اُن کو نکال کر لانا چاہتے ہیں۔ ہماری مدد کیجیے۔ وہ ہمیں ساتھ لے گیا۔ ہم سات آدمی تھے جو اِدھر اُدھر گلیوں اور بازاروں میں آوازیں دینے لگے "مسلمانو! باہر آجاؤ! ہم آپ کو لینے آئے ہیں"۔

میں ایک گلی کے اندر چلا گیا۔ وہاں ایک مکان میں دو ضعیف میاں بیوی رہتے تھے۔ اُن کو باہر نکال کر لایا اور اپنے ساتھیوں کے حوالے کر کے پھر گلی کے اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو نہ ہندو لیڈر تھا نہ میرے ساتھی۔ ذرا فاصلے پر ایک شخص مرا پڑا تھا۔ میں حیران کھڑا تھا کہ دو سِکھوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ میں بھاگ کر گلی کے اندر ایک خالی مکان میں چھُپ گیا۔

کچھ دیر بعد میں نے پڑوس کے گھر میں سِکھوں کو باتیں کرتے سُنا۔ ایک کہہ رہا تھا "ساتھ والے مکان میں بھی دیکھ

لینا چاہیئے۔ شاید کوئی مسلمان چُھپا بیٹھا ہو۔" دوسرے نے جواب دیا "نہیں، اُس میں کوئی نہیں ہے۔ چلو، چلیں"۔ پھر وہ چلے گئے۔

سات روز تک مجھے اُس گھر میں تنہا وقت گزارنا پڑا۔ خود ہی کھانا پکاتا اور زہر مار کرتا۔ ساتویں دن آٹا ختم ہو گیا۔ اب کھاتا تو کیا کھاتا۔ فاقے نے مجھے گھر سے نکل کر شریف پورہ کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ شریف پورہ میں شہر کے بچے کُھچے مسلمان بھاگ کر پناہ گزین ہو گئے تھے۔ مجھے اِس کا علم تھا۔

آٹھویں روز صبح کو میں نے فجر کی نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ کی رحمت پر توکّل کر کے گھر سے نکلا اور شریف پورہ چل دیا۔ زبان پر کلمہ استغفار تھا۔ کرفیو کی وجہ سے سڑکیں سنسان تھیں۔ راستے میں رام باغ کا تھانہ تھا۔ میں وہاں پہنچا تو ایک سِکھ سپاہی بندوق اُٹھائے پہرا دے رہا تھا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اِس سے پہلے کہ وہ زبان سے کچھ کہتا میرے منہ سے بے ساختہ نکلا: کر بھلا، ہو گا بھلا۔ انت بھلے کا بھلا۔ میں یہ مِصرع اُونچی آواز میں پڑھتا نکل گیا۔ سِکھ سپاہی گُم صُم کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ میں چلتے چلتے شریف پورہ پہنچ گیا۔

وہاں مسلمان بھائیوں نے مجھے ناشتا کرایا اور میری داستان سُنی۔ دوسرے دن مسلمان فوج کا ایک دستہ آیا اور اُس نے ہمیں، ریل گاڑی کے ذریعے، لاہور پہنچا دیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مُہاجرین کی آنکھیں خوشی کے مارے اشک بار ہو گئیں۔ سب نے ربِ رحمان کا شکر ادا کیا۔

اب مجھے اپنی بیوی بچّوں کی تلاش ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی میں ہیں۔ میں بھی اُن کے پاس راولپنڈی چلا گیا۔ وہاں اور بھی ہمارے رشتے دار اور ملنے جُلنے والے تھے۔

وہاں میں نے ایک نوجوان سِکھ لڑکی کو دیکھا تو اُس سے پوچھا "بیٹی، تم کون ہو؟"

اُس نے کہا "میرا نام امرت کور ہے اور یہ مکان ہمارا ہے۔ میں اپنی ایک مسلمان سہیلی ثُریّا کے ہاں گئی ہوئی تھی کہ شہر میں زور کا فساد پھوٹ پڑا۔ بلوائیوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ میرے ماں باپ فوج کی حفاظت میں ریلوے اِسٹیشن پہنچ گئے اور پھر امرتسر چلے گئے۔ لیکن وہ مجھے میری سہیلی کے گھر سے نہ لے جاسکے۔ دہشت سے مُجھ پر لرزہ طاری ہو گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سہیلی کے ماتا پِتا نے میری ڈھارس بندھائی اور کہا، بیٹی، تُو بھی ہماری بیٹی جیسی ہے۔ جب تک ہماری جان میں جان ہے، تیرا بال بیکا نہیں ہونے دیں گے۔

ایک ہفتے تک میں وہاں رہی۔ جب شہر میں امن ہُوا تو میں نے اپنے گھر جا کر کپڑے وغیرہ لانے کی خواہش کا اِظہار کیا۔ ثُریّا کے پِتا نے مجھے بُرقع پہننے کو کہا، اور ثُریّا اور مجھے میرے گھر لے گئے۔ یہاں آکر میں آپ کی بیٹی عابدہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ عابدہ نے دوڑ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میں بھی خوشی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عابدہ میری سہیلی ثُریّا کی رشتے کی بہن ہے۔ اُن دنوں وہ اُس کے گھر آئی ہوئی تھی۔ ہم دونوں سہیلیاں بن گئیں"۔

میرے پوچھنے پر امرت کور نے بتایا کہ اُس کا ایک بھائی پولیس میں ہے اور امرتسر میں رام باغ کے تھانے میں لگا ہُوا ہے۔ اُس کا نام وِیر سِنگھ ہے۔ میرے ماتا پِتا اُس کے پاس ٹھہرے ہوں گے۔ میں نے وِیر سِنگھ کو خط لکھا کہ اُس کی بہن امرت کور ہماری حفاظت میں ہے۔ اُسے آکر لے جاؤ۔ یہ خط میں نے اپنے ایک عزیز فوجی افسر کو دیا کہ اِسے وِیر سِنگھ کو پہنچا دے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ وِیر سِنگھ، چند فوجی سپاہی لے کر، اپنی بہن کو لینے آ گیا۔ وِیر سِنگھ کو دیکھ کر میں اور مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اِتنے میں اُس کی بہن امرت کور آ گئی اور بھائی کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اُس نے اُسے بتایا کہ اِنھوں نے مجھے اپنی بیٹی کی طرح رکھا ہے۔

وِیر سِنگھ نے یہ سب کچھ سُنا تو ہاتھ جوڑ کر مجھے پر نام کیا اور میرے پاؤں پڑ گیا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر گلے لگا لیا۔ وِیر سِنگھ نے کہا "پِتا جی، آپ نے سچ کہا تھا کہ

کر بھلا ہو گا بھلا، اَنت بھلے کا بھلا

ڈاکٹر رضوان ثاقب

قلمی دوست

"بیٹا، دُنیا کا سب سے بڑا خزانہ علم ہے اور تمہیں اس خزانے سے مالا مال کرنے کے لیے میں، اپنے خون پسینے کی کمائی سے خود آرام و سکون کی زندگی بسر کرنے کی بجائے، تمہیں تعلیم دلا رہا ہوں۔ میرے مرنے کے بعد میری جیبیں مت ٹٹولنا بلکہ علم کی دولت پر فخر کرنا"۔ میرے والد صاحب اِسکول ٹیچر تھے اور وہ اکثر ہم سے یہی کہا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی ہمیں پڑھانے میں کھپا دی ہے۔ وہ ہمارے کسی دوست کو صرف اس لیے رات کو گھر میں نہیں ٹھہراتے تھے کہ اس طرح ہم رات بھر باتیں کریں گے اور ہماری پڑھائی کا حرج ہو گا۔

ہم اپنی ننھیال تک کو بھول چکے تھے۔ ہمیں نانی، ممانی اور ماموں جان کی شکل دیکھے ہوئے کئی سال گزر گئے تھے۔ جب کبھی ماموں سے ملنے کا تقاضا کیا تو ابا جان نے ہمیشہ یہ کہ کر روک دیا کہ میٹرک کرنے کے بعد جہاں جی چاہے، جانا۔ جس سے ملنے کو دل چاہے، مل لینا۔

والد صاحِب نے ہم پر پابندیاں ہی نہیں لگائی تھیں بلکہ گھر میں ہر وہ سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی تھی جس سے ہمارے علم میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ انہی سہولتوں میں سے ایک سہولت بچوں کے رسالے تھے۔ بچوں کے لیے شائع ہونے والے تمام معیاری رسالے ہمارے گھر آتے تھے۔ ہم سب بہن بھائی انہیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور ان میں دیے گئے انعامی مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ اس طرح میں اور میرے بہن بھائی کئی انعامی مقابلے جیت چکے تھے۔ بچوں کے ان رسالوں میں ایک رسالہ ایسا تھا جس میں "آیئے دوست بنائیں" کے عنوان سے قلمی دوستی کا صفحہ شائع ہوتا تھا، جس میں بچوں کی عمر، جماعت اور مشغلوں کے ساتھ ان کی تصویریں بھی شائع ہوتی تھیں۔

لاہور دیکھنے کا مجھے بچپن ہی سے شوق تھا۔ اس رسالے میں لاہور کے بچوں کا تعارف شائع ہوا تو ان میں میں اپنا ہم عمر اور ہم جماعت لڑکا ڈھونڈنے لگا۔ اتفاق سے مجھے ایسے دو تین لڑکوں کے تعارف مل گئے۔ ان میں مجھے عتیق نام بہت پیارا لگا اور میں نے اسی سے قلمی دوستی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

عتیق لاہور کے ایک علاقے شاد باغ کا رہنے والا تھا اور اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا جب میں نے اسے قلمی دوستی کرنے کے لیے خط لکھا۔ خط پوسٹ کرنے کے چھٹے دن مجھے اس کا جواب موصول ہوا۔ اس نے رنگ برنگی روشنائیوں سے خط لکھا تھا اور حاشیے کے لیے چھوڑی گئی جگہ پر کئی بیل بوٹے بنائے تھے۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا:

شاد باغ لاہور
28 فروری 1988ء

میرے پیارے قلمی دوست، رضوان ۔

بُلبُل کے مُنہ میں ہے گُچھّا انگور کا
ملنے کو جی چاہتا ہے مگر سفر ہے دُور کا

السّلامُ عَلیکُم۔ ہم خیریّت سے ہیں اور آپ سب کی خیریّت نیک چاہتے ہیں۔

آپ نے میرے ساتھ قلمی دوستی کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے، آپ کے خط کا باقاعدگی سے جواب دیتا رہوں گا۔ دیکھیے، میں نے آپ کا خط ملتے ہی آپ کو جواب لکھ دیا ہے۔ اب آپ فوری طور پر مجھے جواب دیں۔ ورنہ ۔

پھول ہے گلاب کا، خوش بو تو لیا کرو
خط ہے عتیق کا، جواب تو دیا کرو

وَالسّلام

آپ کا قلمی دوست
عتیقُ الرّحمان

میری عتیق کے ساتھ خط وکتابت کو کئی سال گزر چکے تھے اور میں نے اس کے سارے خط سنبھال کر رکھے تھے۔

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اب میں رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی سارے گھر والے اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔ ابا جان دفتر چلے جاتے اور بہن بھائی پڑھنے کے لیے اسکول۔ میں اور امی جان گھر میں سارا دن بور ہوتے رہتے۔ امی جان کی تو شاید اکیلے رہنے کی عادت بن چکی تھی، مگر میں اس فراغت سے بہت تنگ آگیا تھا۔

آج بدھ کا دن تھا۔ گھر کے سب لوگ اپنے اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ امی جان کپڑے دھونے میں مصروف تھیں، جب کہ میں اپنے کمرے میں پرانے رسالوں کو ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ رسالوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے میری نظر سے فروری 1988ء کا ایک رسالہ گزرا جس میں میرا لطیفہ شائع ہوا تھا اور میرے قلمی دوست کا تعارُف بھی۔ پہلے تو میں نے اپنے لطیفے والا صفحہ نکالا۔ لطیفے کے نیچے اپنا نام دیکھ کر ایک دفعہ پھر خوش ہوگیا۔ اس کے بعد بچوں کے تعارف والا صفحہ نکالا۔ مگر یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ یہ صفحہ تھوڑا سا پھٹا ہوا تھا اور اس میں سے وہ حصہ غائب تھا جہاں میرے قلمی دوست کا تعارف شائع ہوا تھا۔ پہلے تو میں اپنی چھوٹی بہن گڑیا کو کوسنے لگا، پھر ذہن پر زور دینے لگا کہ عتیق کی تصویر کیسی تھی۔ میرے ذہن میں اس کا حلیہ نہ آسکا۔ آج سے تین چار سال پہلے ایک دو بار اس کی تصویر دیکھی تھی۔ اتنی دیر بعد بھلا کہاں ذہن میں رہ سکتی تھی۔

اب میں رسالے تو ترتیب سے رکھ چکا تھا مگر اپنے قلمی دوست عتیق کی یاد مجھے بہت ستا رہی تھی۔ چناں چہ میں نے عتیق کے خطوں والا تھیلا کھولا اور اس میں سے اس کے خط نکال نکال کر پڑھنے لگا۔ اس نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا "اب قلمی دوستی تو بہت ہوگئی ہے۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے ملنا چاہیے۔ تم میرے گھر آؤ تو مجھے عید سے بڑھ کر خوشی ہوگی۔ اگر تم نہیں آسکتے تو میں ضرور آنے کی کوشش کروں گا"۔

میں آج کل فارغ بھی تھا اور گھر میں اکیلا بور بھی ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ لاہور جاکر عتیق سے مل آؤں۔

شام کو جب والد صاحب دفتر سے آئے تو میں نے ان سے لاہور جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے کہا کہ اکیلے راستہ بھول جاؤ گے۔ جب میں لاہور جاؤں گا تو میرے ساتھ چلنا۔

"جانے بھی دو، میرے بیٹے کو۔ ماشاء اللہ میٹرک کا امتحان دے چکا ہے۔ پڑھے لکھے کو بھلا راستہ بھولنے کا کیا ڈر" امی جان نے کہا "پھر آپ نے اس سے وعدہ بھی تو کیا تھا کہ میٹرک کے بعد اسے گھومنے پھرنے کی اجازت دے دیں گے"۔

ابّا جان امّی کی بات سُن کر کچھ دیر خاموش رہے۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ابھی اس نے میٹرک کا امتحان دیا ہے، میٹرک کیا تو نہیں۔ مگر وہ یہ اس لیے نہیں کہہ پا رہے تھے کہ انہیں معلوم تھا کہ میں بہت لائق اور ہوشیار ہوں میٹرک کا امتحان پاس ہی نہیں کروں گا بلکہ اچھی پوزیشن بھی لوں گا۔

"اسے جانے کی اجازت دے بھی دو۔ ایک ہی تو اس کا دوست ہے اور وہ بھی قلمی" امی جان نے پھر کہا۔

ابا جان بولے "دیکھو بیگم، یہ چلا تو جائے مگر اس سے کہو کہ ایک دن کے اندر اندر واپس آجائے۔ کل صبح یہاں سے اسے گاڑی پر میں بٹھا آؤں گا اور اگلے دن شام کو اس کا دوست اسے وہاں سے بٹھا دے گا۔ میں رات کو اسے ریلوے اسٹیشن سے لے لوں گا"۔

مجھے تو لاہور جانے کی اجازت مل رہی تھی، اس لیے میں ابا جان کی ہر شرط ماننے کو تیار تھا۔ امی جان نے میری طرف دیکھا اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے سب شرطیں منظور کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔

اگلے دن صبح کو ابا جان نے مجھے گاڑی میں بٹھا دیا۔ اب گاڑی فراٹے بھرتی لاہور کی جانب رواں دواں تھی۔ میرے سامنے کی سیٹ پر ایک نوجوان بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد اپنے پاؤں میری سیٹ پر رکھ دیے۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے ترش لہجے میں کہا "یہ کیا بد تمیزی ہے؟ ہٹاؤ اپنے پاؤں؟"

یہ سن کر وہ غصے سے بولا "لگتا ہے کسی نیچ خاندان کے ہو۔ شریف اور مُہذّب لوگوں سے اس طرح بات کرتے ہیں؟"

"بڑا آیا شریف اور مہذب" میں نے کہا، اور اس کی ٹانگوں پر زور سے لات مار کر اس کے پاؤں سیٹ سے ہٹا دیے۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور اب باقاعدہ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔

جب ہم نے ایک دوسرے کے دو چار ٹکا دیں تو قریب بیٹھا ہوا ایک شخص اٹھ کر آیا اور بیچ بچاؤ کرا کر بولا "لگتے تو تم دونوں ہی پڑھے لکھے ہو، مگر کام جاہلوں والا کر رہے ہو" وہ یہ کہتا ہوا اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا، اور ہم دونوں، اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے، سارا راستہ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

لاہور کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو ہم نے ایک دوسرے کو نفرت سے دیکھا اور نیچے اتر گئے۔ میں اسٹیشن سے باہر آیا تو ٹانگے والوں کو گھوڑے شاہ، خواجہ سعید، شاد باغ کی آوازیں لگاتے سنا۔ جو کوچوان شاد باغ کی آواز لگا رہا تھا، میں اس کے تانگے میں بیٹھ گیا۔ جب سواریاں پوری ہوگئیں تو تانگہ چل پڑا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد میں شاد باغ کے ٹوکے والے چوک میں کھڑا تھا۔ اب مجھے تارے والی کوٹھی کو ڈھونڈتا تھا کیوں کہ عتیق نے خط میں لکھا تھا کہ

اس کا گھر تارے والی کوٹھی کے قریب ہے۔

آخر دو ایک لوگوں سے پوچھنے کے بعد میں تارے والی کوٹھی کو ڈھونڈنے میں کام یاب ہوگیا۔ وہاں سے چند مکان چھوڑ کر عتیق کا مکان تھا۔ میں نے اس گھر کی گھنٹی بجائی تو چھ سات سال کا ایک بچہ باہر نکلا اور اس نے پوچھا "جی فرمایئے، کس سے ملنا ہے؟"

"عتیق صاحب گھر پر ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی صاحِب، ہیں صاحِب، عتیق صاحِب" وہ یہ کہتا ہوا گھر چلا گیا۔ اسے شاید عتیق کے ساتھ صاحب کہنا اچھا نہیں لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد عتیق صاحب گھر سے باہر نکلے اور پھر جو کچھ ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ انہوں نے آتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ، مجھے گلے سے دبوچ لیا۔ میں نے گلا چھڑانے کی کوشش کی تو میرے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ اوپر سے عتیق صاحب بھی بول رہے تھے۔ ہماری چیخ پکار سن کر عتیق کا چھوٹا بھائی باہر آگیا۔ عتیق نے اسے دیکھتے ہوئے کہا:

"خلیل! ڈنڈا لے کر آؤ، ڈنڈا!"

خلیل آن کی آن میں ڈنڈا لے آیا، اور عتیق اس ڈنڈے سے مجھے دھننے لگا۔ دو چار ڈنڈے ہی پڑے تھے کہ میں بلبلا اٹھا۔ میری بلبلاہٹ سن کر عتیق کے والد صاحب گھر سے باہر نکلے اور گھبرا کر بولے "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں لڑ رہے ہو؟ چلو، ہٹو"۔ انہوں نے ہمیں بڑی مشکل سے ایک دوسرے سے الگ کیا اور پھر لڑائی کی وجہ دریافت کی۔

"ابو، اس نے پہلے ٹرین میں میرے ساتھ ہاتھا پائی کی اور پھر دوبارہ لڑنے کے لیے میرے پیچھے پیچھے ہمارے گھر آگیا"۔

"کیوں بھئی؟ عتیق سچ کہ رہا ہے یا اصل بات کوئی اور ہے؟" عتیق کے ابو نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"انکل۔ میرا نام رضوان ہے۔ میں اس کا قلمی دوست ہوں۔ میں اس سے ملنے لاہور آرہا تھا کہ ٹرین میں اس سے لڑائی ہوگئی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ میرا قلمی دوست ہے، ورنہ میں اس سے کبھی نہ لڑتا"۔ یہ کہ کر میں نے انہیں لڑائی کی وجہ بتائی۔

عتیق کے ابّو بولے "دیکھو، بیٹا۔ غَلَطی تم دونوں کی ہے۔ عتیق، تمہاری غلطی یہ ہے کہ تم نے رضوان میاں کی سیٹ پر پاؤں رکھے، کیوں کہ کسی کی سیٹ پر پاؤں رکھنا بدتمیزی ہے۔ اور رضوان میاں، تمہاری غلطی یہ ہے کہ تم ایک دم آپے سے باہر ہوگئے۔ اگر تم نرم اور ملائم لہجے میں عتیق سے پاؤں ہٹانے کو کہتے تو یہ پاؤں ہٹا لیتا اور نوبت لڑائی جھگڑے تک نہ پہنچتی۔ بیٹا، خوش خلقی یعنی اچھا اخلاق بہت اچھی چیز ہے۔ ہمیں ہر ایک کے ساتھ، چاہے وہ اپنا ہو یا پرایا، خوش خلقی سے پیش آنا چاہیے"۔

اس کے بعد انکل ہم دونوں کو ڈرائینگ روم میں لے گئے۔ میرے دل پر انکل کی گفت گو کا بہت اثر ہوا تھا اور میں عتیق سے معافی مانگنا چاہتا تھا مگر عتیق مجھ سے بازی لے گیا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی اور پھر ہم دونوں گلے ملے۔ سارا دن خوش گپیوں میں گزرا اور ہم اپنی اپنی خفت کو ہنسی مذاق میں ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ شام ہوئی تو میں نے واپسی کا سوچا۔ میں نے کچھ بولنے کی ہمت کی تو آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"عتیق، مجھے آپ سے مل کر ایک قیمتی سبق مل گیا۔ اب میں ہر ایک کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آیا کروں گا" میں نے کہا۔

"اور میں بھی" عتیق نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

میں لاہور سے واپس آیا تو ابا جان اسٹیشن پر موجود تھے۔ انہوں نے راستے میں میری اپنے قلمی دوست سے ملاقات کا احوال پوچھا۔ وہ بھی اس بات پر خوب خوش ہوئے کہ میرا بیٹا ناکام واپس نہیں لوٹا، بلکہ اس سفر سے کچھ سیکھ کر ہی آیا ہے۔

امان اللہ نیّر شوکت

لیاقت علی خان

وطن کے مُقدر کو تُو نے سنوارا
کسی موڑ پر تیرا جذبہ نہ ہارا
لیاقت دکھائی زمانے کو ایسے
کہ سب نے لیاقت لیاقت پُکارا
لیاقت' ترا نام زندہ رہے گا

تری زندگی قوم کے واسطے تھی
تری ہر خوشی قوم کے واسطے تھی
نہ بھولیں گے ہم تیری قُربانیوں کو
تری موت بھی قوم کے واسطے تھی
لیاقت' ترا نام زندہ رہے گا

مُصیبت میں اپنا سہارا بنا تُو
خدا کا کرم تھا کہ ہم کو مِلا تُو
تجھے تو مِلا ہے شہادت کا رُتبہ
کوئی کس طرح یہ کہے، مرگیا تُو
لیاقت' ترا نام زندہ رہے گا

شکاری پرندے

شِکاری پرندے اُن پرندوں کو کہتے ہیں جو دوسرے جانوروں کو مار کر اُن کا گوشت کھاتے ہیں۔ یہ پرندے عام طور پر اپنے سے چھوٹے جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ اِن میں سے بعض، مثلاً گِدھ، شکار نہیں کرتے بلکہ مرے ہوئے جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں۔ لیکن اِنھیں بھی شکاری پرندے کہا جاتا ہے۔

شکاری پرندوں کے بازو بہت مضبوط ہوتے ہیں، اور یہ بہت اچھّے ہوا باز ہیں۔ اِن کے پنجے بھی بہت مضبوط، نوکیلے اور مُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اِنھی سے وہ اپنے شکار کو پکڑتے ہیں۔ اِن کی چونچ بھی بہت تیز اور نوکیلی ہوتی ہے۔ اِس سے وہ اپنے شکار کی تِکّا بوٹی کرتے ہیں۔ عُقاب، شاہین، باز، شِکرا اور گِدھ شکاری پرندے ہیں۔ اُلّو بھی چھوٹے موٹے جانوروں کا شکار کرتا ہے، لیکن اِسے شکاری پرندوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔

مُختلِف شکاری پرندے مُختلِف طریقوں سے شکار کرتے ہیں۔ عام عُقاب گھنے درختوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور جوں ہی کوئی پرندہ، درختوں میں سے نکل کر، کُھلی جگہ پر آتا ہے، یہ اُس پر جھپٹ پڑتے ہیں اور چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔

اعلیٰ قِسم کا باز جسے شاہین کہتے ہیں، بہت بلندی پر اُڑتا ہے۔ جب اُسے، نیچے، کوئی چھوٹا پرندہ اُڑتا دکھائی دیتا ہے تو بجلی کی سی تیزی سے غوطہ لگاتا ہے اور پرندے کو، پنجہ مار کر، اَدھ مُوا کر دیتا ہے۔ پرندہ مار کھا کر نیچے گرنے لگتا ہے تو باز اُسے پنجے میں دبوچ کر لے جاتا ہے۔

ایک چھوٹی قسم کا باز، جسے شِکرا کہتے ہیں، ہوا میں اُڑتے ہوئے، زمین پر نگاہ رکھتا ہے۔ جوں ہی اُسے زمین پر کوئی چھوٹا موٹا جانور چلتا پھرتا نظر آتا ہے، وہ ایک دم غوطہ لگاتا ہے اور اُسے پنجے میں دبوچ لیتا ہے۔ دوسرے چھوٹے شکاری پرندے، مثلاً "چڑیا باز" کم بلندی پر پرواز کرتے ہیں، اور درختوں کے درمیان اُڑتے ہوئے اپنے سے چھوٹے پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ سفید پیٹ والا عُقاب، جو جنوب مشرقی ایشیا کے ساحلوں پر پایا جاتا ہے، سمندری مچھلیاں اور سانپ پکڑتا ہے۔ گِدھ، بہت بلندی پر، گھنٹوں

باز

اڑتے رہتے ہیں۔ اِن کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے۔ اِنہیں زمین پر کسی جانور کی لاش نظر آتی ہے تو فوراً اُس پر دھاوا بول دیتے ہیں۔

شکاری پرندوں میں گِدھ سب سے بڑا پرندہ ہے۔ اِس کی ایک قِسم یورپ، افریقہ اور ایشیا میں پائی جاتی ہے اور دوسری قِسم شمالی، وسطی اور جنوبی امریکا میں۔ پاکستان اور ہندوستان کا گِدھ 30 اِنچ کے قریب لمبا ہوتا ہے، لیکن جنوبی امریکا کے "انڈیز" پہاڑوں پر پایا جانے والا گدھ، جسے کونڈر کہتے ہیں، 4 فٹ سے بھی زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ اِس کے بازو 10 فٹ تک لمبے ہوتے ہیں اور وزن 28 پونڈ (تقریباً 14 کلوگرام) ہوتا ہے۔ اِتنے بڑے پرندے کو کھانے کے لیے کافی خوراک چاہیے۔ چُناں چہ کونڈر دن میں ایک پونڈ (تقریباً آدھا کلو) گوشت کھاتا ہے۔ اگر اِسے کوئی مُردار جانور نہ ملے اور بہت بھوکا ہو تو میمنوں اور بچھڑوں پر حملہ کردیتا ہے۔

گِدھ مُردہ جانوروں کا گوشت کھا کر فضا کو گندگی سے پاک صاف رکھتے ہیں۔ یہ عموماً گندے اور بدصورت ہوتے ہیں، لیکن میکسیکو (میک سی کو) اور ارجنٹینا (ارجن ٹی نا) کا گدھ جسے بادشاہ گدھ کہتے ہیں، کچھ خوب صورت ہوتا ہے۔ اِس کی گردن اور چونچ لال اور پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ پر بھی ہلکی سی پیلاہٹ لیے ہوتے ہیں۔

شکاری پرندے اپنے شکار کو پنجوں سے ہلاک کرتے ہیں۔ بعض چونچ بھی اِستعمال کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے تیز اور مُڑے ہوئے ناخن یا پنجے ہی اُن کے خاص شکاری ہتھیار ہیں۔ اِنہی سے وہ شکار کو پکڑتے اور پھر چونچ سے اُس کی تِکّا بوٹی کرتے ہیں۔ اِسی لیے قدرت نے اُن کے پنجوں پر بال پیدا نہیں کیے۔ پنجوں پر بال ہوتے تو وہ خون میں لتھڑ جاتے اور پرندے کے لیے اُسے صاف کرنا بہت مُشکل ہوتا۔ البتہ اُلّو کے پنجوں پر بال ہوتے ہیں، کیوں کہ اُلّو اپنے شکار کو سمُوچا نِگل جاتا ہے۔ اُسے چیر پھاڑ کے نہیں کھاتا۔

گِدھوں کے سر اور گردن پر بال نہیں ہوتے۔ کیوں کہ یہ پرندے مُردار جانوروں کے پیٹ کے اندر گردن

ڈال کر اُس کی انتڑیاں وغیرہ کھاتے ہیں۔ اِن کی چونچ اور پنجے بھی، عُقاب اور باز کی طرح، تیز اور مضبوط نہیں ہوتے۔ کیوں کہ قدُرت نے اِنھیں شکار کے لیے نہیں بنایا ہے۔

شکاری پرندوں میں سب سے شان دار پرندہ سُنہری عُقاب (گولڈن اِیگل) ہے۔ یہ تین فٹ لمبا ہوتا ہے، اور اِس کے بازوؤں کی لمبائی 8 فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ شکاری پرندہ دور دراز پہاڑی علاقوں میں پایا جاتا ہے اور بہُت لمبی عُمر پاتا ہے۔ نر اور مادہ مرتے دم تک اِکٹھے رہتے ہیں اور پہاڑوں پر ایسی جگہ گھونسلا بناتے ہیں جہاں کسی جانور یا اِنسان کا پہنچنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

سُنہری عُقاب کی مادہ، عام طور پر، دو انڈے دیتی ہے اور دونوں انڈوں کے درمیان چند روز کا وقفہ ہوتا ہے۔ (یعنی پہلا انڈا دینے کے چند روز بعد دوسرا انڈا دیتی ہے)۔ پہلے انڈے میں سے نکلنے والا بچّہ، دوسرے بچّے کے مقابلے میں کچھ بڑا اور تگڑا ہوتا ہے۔ اگر ماں باپ اُنھیں کافی خوراک نہ دے سکیں تو بڑا بچّہ چھوٹے بچّے کی خوراک بھی کھا جاتا ہے، اور وہ بے چارہ بھوکوں مرجاتا ہے۔ خوراک کافی ہو تو دونوں زندہ رہتے ہیں اور 10 ہفتے بعد ماں باپ کا گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن کچھ دن اُن کے آس پاس ہی رہتے ہیں تاکہ اُن سے شکار کے گُر اور داؤ پیچ سیکھ سکیں۔

سَدھائے ہوئے بازوں کے ذریعے پرندوں کا شکار کرنا پُرانے زمانے کے بادشاہوں اور امیروں کا محبوب مشغلہ تھا۔ آج کل صِرف عرب شیخ اِس مقصد کے لیے باز پالتے ہیں اور اُن پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ چُوں کہ اِس کے لیے بہُت صبر اور پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، اِس لیے عام لوگ یہ مشغلہ نہیں اپنا سکتے۔

سَدھا ہُوا (تربیت یافتہ) باز اپنے مالک کے ہاتھ پر بیٹھا ہوتا ہے۔ جب مالک کو آسمان میں کوئی پرندہ اُڑتا نظر آتا ہے تو وہ باز کو اُس پر چھوڑ دیتا ہے۔ باز آناً فاناً شکار تک پہنچ جاتا ہے اور اُسے پکڑ کر مالک کے پاس لے آتا ہے۔ مالک کے ہاتھ پر چمڑے کا دستانہ چڑھا ہوتا ہے تاکہ وہ باز کے تیز ناخنوں سے محفوظ رہے۔ بعض لوگ اپنے باز کے پاؤں میں گھنٹی باندھ دیتے ہیں تاکہ وہ شکار کا پیچھا کرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جائے تو گھنٹی کی آواز سے اُس کا پتا چلایا جا سکے۔ (س۔ل)

شکاری پرندوں کے پنجے

اِس کہانی کا عُنوان لِکھیے اور 250 روپے کی کتابیں اِنعام لیجیے۔

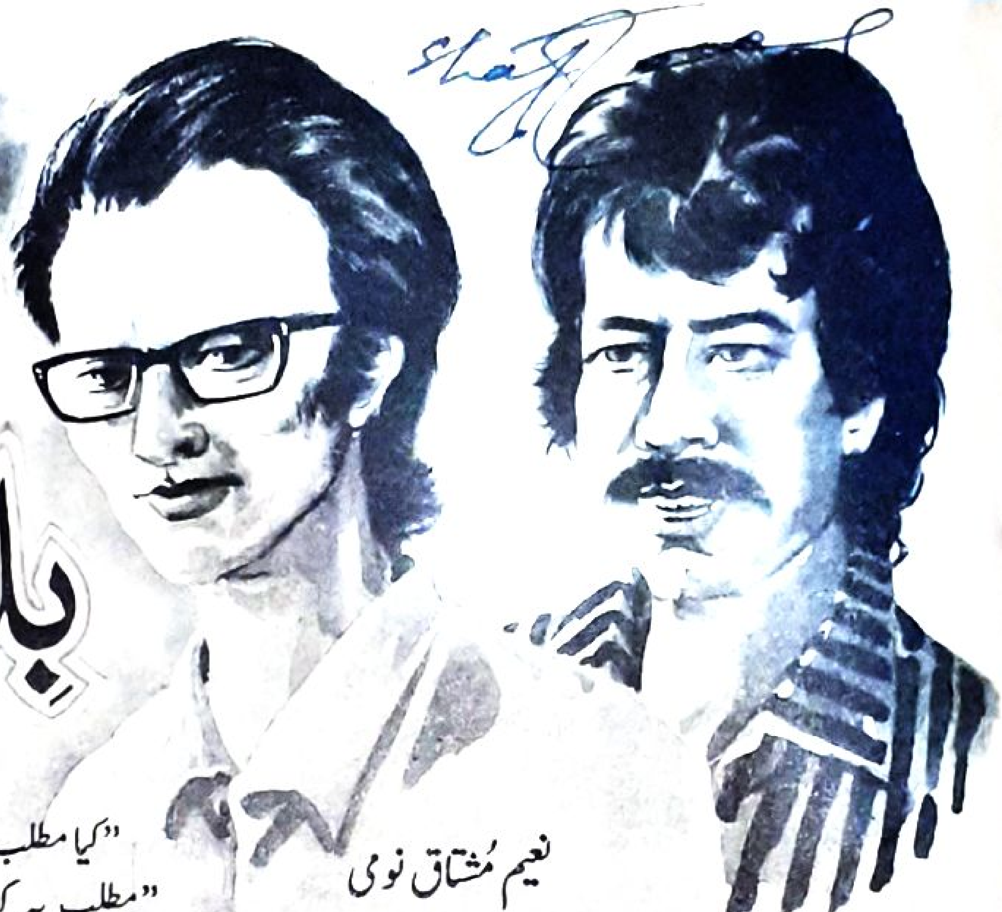

بلا عُنوان

نعیم مُشتاق نومی

وہ دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ ایک کا نام کاشی اور دوسرے کا پاشی تھا۔

دوست تو وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے تھے مگر اُن کی عادتیں اچھی نہیں تھیں۔ وہ ہر قسم کا غلط کام کرتے تھے۔ مثلاً چوری، فراڈ، دھوکے بازی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ اب اُن کی زندگی کا حِصّہ بن چکا تھا۔ اور وہ ان باتوں کے اِتنے عادی ہو چکے تھے کہ اِن کاموں کے عِلاوہ اُن کو کچھ سُوجھتا ہی نہ تھا۔ شاید اِس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ آج تک کبھی پکڑے نہیں گئے تھے۔ لہٰذا اب وہ خود کو اِن کاموں کا اُستاد سمجھتے تھے۔

وقت گزرتا رہا اور آخرکار ایک دن وہ پولیس کی نگاہوں میں آ ہی گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ کبھی یہاں چھُپ اور کبھی وہاں چھُپ۔ پھر ایک دن وہ اِس بھاگ دوڑ سے تنگ آگئے اور سر جوڑ کر بیٹھے۔ اب اُنہیں اِس مسئلے کا حل ڈھونڈنا تھا۔

"میرا خیال ہے، اب ہمارا دانہ پانی یہاں سے اُٹھ چکا ہے" کاشی خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟"۔ پاشی چونک کر اُس کا مُنہ تکنے لگا۔

"مطلب یہ کہ اب ہمیں یہ مُلک چھوڑنا پڑے گا" کاشی نے کہا "اور اگر نہ چھوڑا تو پولیس ہمیں نہیں چھوڑے گی۔ ایک نہ ایک دن ضرور دھر لے گی۔"

"کاش! ہم نے سیٹھ کریم کو قتل نہ کیا ہوتا" پاشی ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"جو ہو چکا وہ تو اب واپس نہیں آسکتا" کاشی نے کہا "اب تو یہ سوچو کہ یہاں سے نکلیں کیسے اور کس مُلک کا رُخ کریں؟"

"ہُوں" پاشی سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے، ہمیں رشیدے راکٹ سے بات کرنی چاہیے۔ وہ لوگوں کو باہر بھیجنے کا کاروبار کرتا ہے"۔

"ہاں، واقعی" کاشی بولا "وہی ہمارا مسئلہ حل کر سکتا ہے"۔

وہ اُسی دن رشیدے راکٹ سے ملے۔ مُعاملات طے ہوئے اور چند دن بعد وہ لندن پہنچ گئے۔

اب وہ مُطمئن بھی تھے، خوش بھی تھے اور محفوظ بھی تھے۔ اور کیسے نہ ہوتے۔ وہاں اُنہیں بھلا کون جانتا تھا۔ وقت کا دھارا بہنے لگا اور اُن کی جمع پُونجی، جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے، ساتھ چھوڑنے لگی۔ تب اُنہیں روٹی کی فِکر ہوئی۔

"رقم تو اب ختم ہوتی جارہی ہے ...... اب کیا کیا

جائے؟" ہاشی نے کہا "میرا مطلب ہے ..... کاروبار_ ایک ترکیب آگئی۔
دغیرہ!"۔
"کاروبار تو وہ کرتے ہیں جن کا کاروبار ہوتا ہے" پاشی مسکرا کر بولا۔
"کیا مطلب؟" کاشی نے پوچھا۔
"مطلب صاف ہے" پاشی دیدے گھما کر بولا "ہمارا کاروبار نہیں بلکہ دھندا ہے' دھندا"۔
"مجھے تو لگتا ہے تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے" کاشی اُسے گھور کر بولا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب؟" کاشی نے اُس کی طرف یوں دیکھا' جیسے کہ بچّے کی بے وقوفی پر اُسے سمجھاتے ہیں "ارے بے وقوف آدمی' یہ اپنا ملک نہیں ہے۔ یہ لندن ہے' لندن۔ یہاں کی پولیس ہماری پولیس کی طرح نہیں ہے۔ سمجھے؟"
"تو کیا یہاں مجرم نہیں ہوتے؟" پاشی ہنسا۔
"ہوتے ہیں، کیوں نہیں ہوتے" کاشی گڑبڑا کر بولا۔
"تو کیا ہماری یہاں گنجائش نہیں نکل سکتی" پاشی بدستور مسکرا رہا تھا۔
"ارے بھئی' یہاں کے مجرم ہم سے زیادہ چالاک اور ترقّی یافتہ ہیں" کاشی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی "اُن کا گزارہ تو یہاں ہو سکتا ہے' ہمارا نہیں"۔
"وہ بھی انسان ہیں اور ہم بھی انسان" پاشی بولا "پھر ہمارا گزارہ کیسے نہیں ہو سکتا؟"
"اِس کا مطلب ہے تم نہیں مانو گے" کاشی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔
"ڈرنے کی ضرورت نہیں" پاشی نے اُس کی کمر تھپکی "ہم جو کچھ کریں گے' سوچ سمجھ کر اور ہاتھ پاؤں بچا کر کریں گے۔ اطمینان رکھو" اُس نے تسلّی دی۔
"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی" کاشی بولا۔
اس کے بعد وہ مل کر سوچنے لگے کہ کیا کریں اور کیسے کریں۔ آخر دو دن کی مغزماری کے بعد پاشی کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔
"سیانے سچ ہی کہتے ہیں" وہ چہک کر بولا "کوشش میں کام یابی ہے"۔
"پھر.....؟" کاشی ہونقوں کی طرح اُس کا مُنہ تکنے لگا۔
"پھر کیا؟ میں نے بھی کوشش کی اور کام یاب ہوا" پاشی نے کہا "میں نے ایک ایسی ترکیب سوچی ہے کہ سُنو گے تو جھوم اُٹھو گے" اُس کا چہرہ اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔
"تو جلدی سے بتاؤ ناں" کاشی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پاشی اُسے اپنی ترکیب بتانے لگا۔ ترکیب سُن کر کاشی جھوم اُٹھا۔
"مان گئے اُستاد۔ ترکیب ہو تو ایسی ہو۔ کیا بات ہے!" کاشی نے کہا "اس میں خرچہ بھی کم ہے اور خطرہ بھی کم۔ قسم سے' یُوں لگتا ہے جیسے شیطان کے خالو ہو تم۔"
جواب میں پاشی اترا کر بولا "میں شیطان کا بھی خالو ہوں اور تمہارا بھی" اُس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔
کچھ دیر اسی طرح ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ پھر کاشی نے پاشی سے پوچھا "یہ منصوبہ شروع کب کرنا ہے؟"
پاشی مسکرایا "آج سے شروع کردیں؟"
"وائے ناٹ ......؟" کاشی بھی مسکرایا۔ پھر چند لمحوں بعد چونک کر بولا "یہ پائپ کہاں سے لیں گے؟"
"یہ کوئی مسئلہ نہیں" کاشی مسکرا کر بولا "اِس مسئلے کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ یُو ڈونٹ وری۔ پہلے مشین کے سُوراخ کا ناپ لیں گے' پھر پائپ لیں گے اور پائپ کہاں سے لیں گے؟ کیسے لیں گے؟ یہ میں جانتا ہوں۔ بس تم دیکھتے جاؤ۔"
کچھ دیر بعد وہ اپنی مُہم پر نکل چکے تھے۔
اُنہوں نے عِلاقے کا اِنتخاب بھی کرلیا تھا اور وقت کا بھی۔ اِس کے عِلاوہ منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اُنہیں جو چند چیزیں چاہیئے تھیں' اُن کا اِنتظام بھی وہ کر چکے تھے۔ یہ

تین چیزیں تھیں- ایک کرائے کی کار، چند پاؤنڈ اور ایک بیگ-

کارروائی کرنے سے پہلے اُنھوں نے پھر اپنے منصوبے کا جائزہ لیا- اُس میں کوئی خامی نہ تھی- تب وہ مُطمئِن ہو کر اپنی کرائے کی کار میں بیٹھے اور وقتِ مُقرّرہ پر اُس علاقے میں جا پہنچے-

شام کے سات بجے جب وہ واپس لَوٹے تو بہُت خوش تھے- کیوں کہ اُس وقت اُن کے پاس 500 پونڈ کے لگ بھگ رقم تھی، جو 25,000 پاکستانی روپوں کے برابر تھی- اُنھیں اپنے کام میں نہ تو کوئی دُشواری پیش آئی اور نہ کسی پولیس والے سے پالا پڑا- لہٰذا اُن کا خوش ہونا اچنبھے کی بات نہ تھی-

رات کے دس بج رہے تھے- دونوں دوست کھانا کھانے کے بعد کافی بھی پی چکے تھے اور اب گپ شپ لگا رہے تھے-

"مجھے اُمّید نہیں تھی کہ یہ مُہم اِتنی آسان ثابت ہوگی" کاشی نے کہا-

"تم ٹھیک کہتے ہو" پاشی نے تائید کرتے ہوئے کہا "مگر اِس کا رزلٹ تو کل نکلے گا ناں"-

"رزلٹ؟" کاشی اُس کا مُنہ تکنے لگا "کیسا رزلٹ؟"

"تم بھی نِرے بدّھو ہی ہو" پاشی اُس کی کم عقلی پر ماتم کرتے ہوئے بولا "ارے بھئی، جو کچھ ہم نے کیا ہے، اُس کے رزلٹ کی بات کر رہا ہوں مَیں- اب کل پتا چلے گا کہ پولیس نے اور اخبار والوں نے کیا کیا"-

"اور ٹی وی والے؟" کاشی نے یاد دِلایا "اور ریڈیو والے بھی؟"

"ہاں، وہ بھی"- پاشی نے کہا "اُن کو تو میں بھول ہی گیا تھا- وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں اپنے مُلک کے ماحول کا عادی ہوں، اور وہاں ٹی وی اور ریڈیو کو اِس طرح کے کسی کام کے لیے اِستعمال نہیں کیا جاتا"-

"جس سے ہم جیسوں کو فائدہ ہوتا ہے" کاشی نے ٹکڑا لگایا-

"ہاں، بالکُل" پاشی بولا "بہرحال، اب تو کل ہی پتا چلے گا کہ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے- فی الحال تو آرام کرتے ہیں"-

"ہاں، بالکل" کاشی نے کہا، پھر چونک کر بولا "مگر بھئی، پہلے اِس کا تو کچھ کریں" اُس نے اُس بیگ کی طرف اِشارہ کیا، جس میں اُن کی آج کی کمائی 500 پونڈ کی شکل میں موجود تھی "کہیں ...."-

"پاشی نے فوراً اُس کی بات کاٹ دی "کوئی منحوس بات مُنہ سے نہ نکالنا، پلیز"-

"رائٹ، سر" کاشی مسکرا کر بولا-

"اوکے" کاشی مسکرا کر بولا-

دونوں نے اُٹھ کر وہ رقم چھپائی، پھر سونے کے لیے لیٹ گئے-

صبح وہ جلد ہی اُٹھ گئے- ناشتا کرتے ہوئے کاشی نے ٹی

وی آن کر دیا۔ اُس وقت خبریں ہو رہی تھیں اور نیوز کاسٹر بوسنیا کے بارے میں بتا رہا تھا۔

چند منٹ بعد وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، کیوں کہ اب لندن کی خبروں کی باری آگئی تھی اور پہلی خبر اُنھی کی واردات کے بارے میں تھی۔ نیوز کاسٹر کہَ رہا تھا "اب لندن کی خبریں۔ کل شام، شہر کے جنوبی حصّے میں، چوری کی ایک عجیب و غریب واردات ہوئی۔ سٹی رپورٹر کے مُطابق، کل دوپہر سے شام تک کسی وقت تمام پبلک ٹیلی فون بُوتھ عجیب و غریب طریقے سے لُوٹ لیے گئے۔ تفصیلات کے مطابق، وہ کمپیوٹر مشین جو ٹیلی فون کے ساتھ اٹیچ ہوتی ہے، اُس کے سوراخ میں پائپ ڈالا گیا اور پھر پائپ میں ہاتھ ڈال کر وہ تمام رقم نکال لی گئی جو کال کرنے والوں نے اُس میں ڈالی تھی۔" نیوز کاسٹر تفصیل بتا رہا تھا اور ٹی وی اِسکرین پر ایک پبلک کال بُوتھ دکھایا جا رہا تھا جس میں ٹیلی فون کے ساتھ لگی ہوئی کمپیوٹر مشین کے سوراخ میں ایک پائپ نظر آرہا تھا۔ اِسی سوراخ میں لوگ رقم ڈال کر کال کرتے ہیں۔

کاشی اور پاشی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

نیوز کاسٹر کہَ رہا تھا "مجُرموں نے اپنے پیچھے کوئی سُراغ نہیں چھوڑا، مگر پولیس بڑی سرگرمی سے تفتیش کر رہی ہے۔ ڈی ایس پی صاحِب کا کہنا ہے کہ ہم جلد ہی مجرموں تک پہنچ جائیں گے۔" اس کے بعد ٹی وی پر ڈی ایس پی کی ٹی وی کے نمائندے سے بات چیت دکھائی گئی۔

کاشی اور پاشی یہ سب کچھ بڑے غور سے دیکھ اور سُن رہے تھے۔ ڈی ایس پی کے چھوٹے سے انٹرویو کے بعد نیوز کاسٹر نے کہا "اور اب خلیج کی خبریں"۔ کاشی نے اُٹھ کر ٹی وی آف کر دیا۔

"میرا خیال ہے، وہ ہم تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے" پاشی نے مسکرا کر کہا۔

"ہر مجُرم یہی سوچتا ہے" کاشی کسی فلسفی کی طرح بولا۔

"کیا مطلب؟" پاشی چونکا۔

کاشی کندھے اُچکا کر بولا "کچھ نہیں۔ میں تو ویسے ہی ایک جنرل بات کر رہا تھا۔"

اِس کے بعد انُھوں نے ریڈیو کی خبریں سُنیں، اخبار کھنگالا۔ مگر کہیں بھی ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے اُنھیں تشویش ہوتی یا کوئی فِکر لاحِق ہوتی۔

"اب باہر جاکر لوگوں کو چیک کرتے ہیں" پاشی نے کہا "دیکھیں، اِس واردات کے بارے میں اُن کا کیا خیال ہے"۔ وہ فوراً تیاّر ہو کر باہر نکل گئے۔

گزُرتے گزُرتے، اُن کی واردات کو دو ہفتے گزُر گئے۔ وہ ہر روز باقاعدگی سے ٹی وی دیکھتے، ریڈیو سُنتے، اخبار پڑھتے اور باہر جاکر حالات کا جائزہ بھی لیتے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ کسی کو اب اِس واردات سے دل چسپی نہ تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھ رہے تھے، کیوں کہ وہ نہ صرف اپنے ملک میں محفوظ رہے تھے بلکہ یہاں کی پولیس بھی اُن تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

"تم تو کہتے تھے، یہاں کی پولیس بہُت تیز طرّار اور پتا نہیں کیا کچھ ہے" پاشی کے لہجے میں طنز تھا "اب بتاؤ، پندرہ بیس دن سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، پولیس کو کوئی سُراغ ملا؟"

"یہ تم مجُھ پر طنز کر رہے ہو یا پولیس کی کم عقلی پر ماتم کر رہے ہو؟ یا پھر اپنی اِسکیم کی کام یابی کے شادیانے بجا رہے ہو؟" کاشی اُسے گھور کر بولا "آخر کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"اب زیادہ سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں" پاشی مسکرا کر بولا "میں تو فقط اِتنا کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر ہاتھ پاؤں بچا کر، مناسب طریقے سے، کام کیا جائے تو پولیس چاہے یورپ کی ہو یا کسی اور جگہ کی، کچھ نہیں کر سکتی۔ کیا سمجھے؟"

کچھ دیر اِسی طرح کی گفُت گوُ ہوتی رہی، پھر کاشی نے پوُچھا "اب آگے کیا پروگرام ہے؟"

"پروگام کیا ہونا ہے۔ کچھ عرصہ ریسٹ کریں گے۔ پھر

کام شروع" پاشی نے لاپروائی سے کندھے جھٹکے۔
اب اُن کی واردات کو ڈیڑھ مہینا گزر چکا تھا۔ اِس دوران میں اُنھوں نے دوسری واردات کے لیے علاقے کا اِنتخاب بھی کر لیا تھا اور وقت اور دِن کا بھی۔
"میرا خیال ہے، اب ہمیں حرکت میں آجانا چاہیے" کاشی نے کہا۔
"ہاں۔ اب تو کافی عرصہ گزر گیا ہے" کاشی نے تائید کی "پولیس بھی خاموش ہے اور واردات کے بعد ہر بُوتھ پر جو نگران لگا دیے گئے تھے، وہ بھی کب کے ختم ہو چکے ہیں"۔
"آج ہم ایک بار پھر پورے علاقے کا چکّر لگائیں گے" پاشی نے کہا "تاکہ اگر کوئی نئی بات ہوئی ہو یا کسی خطرے کا کوئی اِمکان ہو تو اُس کا توڑ پہلے سے کیا جا سکے"۔
اگلے دن اُنھوں نے بڑی کام یابی سے واردات کی اور خیریّت سے گھر پہنچ گئے۔ اِس بار 600 پونڈ کی رقم اُن کے ہاتھ لگی تھی۔ دونوں بہت خوش تھے، بہت ہی خوش۔
اُنھوں نے پروگرام کے مُطابق وہ گھر چھوڑ دیا اور ایک اور گھر میں شِفٹ ہو گئے جو اُنھوں نے پہلے سے کرائے پر لے رکھا تھا۔
دوسرے دن شام کو پاشی اچانک چونکا۔ کیوں کہ اُس کے ہاتھوں پر چھوٹے چھوٹے آبلے نکل آئے تھے۔
"یہ کیا؟" اُس نے کاشی سے کہا "دیکھو تو۔ یہ چھالے کیسے ہیں؟" اُس نے اپنے ہاتھ اُسے دکھائے۔
کاشی نے اُس کے ہاتھوں کا مُعاینہ کیا، پھر بولا "میرا خیال ہے، رات کو کوئی زہریلا کیڑا تمھارے ہاتھوں پر سے گزر گیا ہے۔"
"ہو سکتا ہے" پاشی پریشان سا تھا۔
"گھر میں تو کوئی ایسی شے نہیں ہوگی جو چھالوں پر لگائی جائے" کاشی سوچتے ہوئے بولا۔
"صبح تک دیکھ لیتے ہیں" پاشی اپنے ہاتھوں کو گھورتے ہوئے بولا "اگر آرام آگیا تو ٹھیک ورنہ کسی ڈاکٹر کے پاس چلیں گے"۔

اِس کے بعد اُنھوں نے کھانا کھایا اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئے۔

صبح تک پاشی کی حالت کافی بگڑ چکی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ سُوج گئے تھے اور اُن میں کافی درد ہو رہا تھا۔

"مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو" پاشی نے درد سے تڑپتے ہوئے کہا۔

"چند مِنٹ صبر کرو" کاشی نے کہا "میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں"۔

کچھ دیر بعد وہ ایک پرائیویٹ کلینک میں تھے۔ ڈاکٹر نے چیک اَپ کرنے کے بعد کہا "آپ کو ایک دن ہمارے کلینک میں ہی رہنا ہو گا"۔

"رائٹ، سر" کاشی نے کہا۔

ڈاکٹر نے اپنے وارڈ بُوائے سے کہا "اِنہیں کمرا نمبر سات میں پہنچا دو"۔

"سر، کوئی گڑبڑ والی بات تو نہیں ہے؟" کاشی پریشان ہو کر بولا۔

"ڈونٹ وری"۔ ڈاکٹر نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تھینک یُو، سر"۔ کاشی نے اِطمینان کا سانس لیا۔

کاشی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، جب کہ پاشی بیڈ پر سویا ہوا تھا۔ اُس کی نیند اُس انجکشن کی وجہ سے تھی، جو ڈاکٹر کے کہنے پر نرس نے لگایا تھا۔

اُس وقت اُنہیں کلینک میں آئے دو گھنٹے گزر چکے تھے، اور وہ کمرا نمبر 7 میں تھے۔

اچانک کمرے کا دروازہ کُھلا اور دو پولیس والے اندر آئے اُن کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

"ڈونٹ مُوو" ایک سپاہی نے پستول تان کر کہا۔ کاشی ہکا بکّا اُن کا مُنہ تک رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں چیخ چیخ کر پُوچھ رہی تھیں "تم لوگ ہم تک کیسے پہنچے؟"

"آپ کو پولیس اِسٹیشن چلنا ہو گا" اِنسپکٹر نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" کاشی فوراً سنبھل کر بولا۔

"پہلے آپ کا میڈیکل چیک اَپ ہو گا، پھر باقی باتیں ہوں گی" پولیس والے نے اب بھی پستول تان رکھا تھا۔

اِنسپکٹر نے سپاہی کو اِشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور کاشی کی تلاشی لینے لگا۔

"میڈیکل چیک اَپ کس لِیے اِنسپکٹر......؟" کاشی نے پُوچھا۔

"یہ ابھی نہیں بتایا جا سکتا" اِنسپکٹر نے کہا۔

پولیس والوں نے اُن دونوں کو گاڑی میں بٹھایا اور تھانے لے گئے۔

چیک اَپ کے بعد اُنہیں جیل پہنچا دیا گیا۔ وہاں پاشی کا عِلاج بھی ہونے لگا۔ وہ دونوں سخت حیران تھے کہ پکڑے کیسے گئے؟ اُنھوں نے کون سا ایسا ثبوت چھوڑا تھا جس کی

مدد سے پولیس اُن تک پہنچ گئی؟ اِس سوال کا جواب اُنہیں کچھ دِنوں بعد مِل گیا' جب عدالت میں پہلی پیشی پر اُنہیں سزا ہو گئی۔

پولیس اُن تک کیسے پہنچی؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟

نہیں بتا سکتے؟ تو آیئے پھر لندن کا ایک اخبار پڑھتے ہیں' جس میں کاشی اور پاشی کے بارے میں پُورا فیچر چھپا تھا۔

اخبار کے رپورٹر نے لکھا تھا: پہلی واردات کے بعد اِنسپکٹر وِلیَم نے اپنے کچھ آدمی' سادہ لباس میں' تمام پبلک ٹیلی فون بُوتھوں کی نگرانی کے لیے مُقرّر کر دیے۔ پھر دو تین دن بعد اُنہیں ہٹا دیا۔ اِس کے بعد ٹیلیفون بُوتھوں میں ایک خاص قسم کی گیس بھر دی۔ اِس گیس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر یہ کسی جان دار کے جسم پر لگ جائے تو 24 گھنٹے بعد اُس جگہ چھالے نکل آتے ہیں' اور اُن میں درد کی ٹیسیں اُٹھتی ہیں۔ لٰہذا جب کاشی اور پاشی دوسری بار واردات کرنے گئے اور پاشی نے پائپ میں ہاتھ ڈال کر رقم نکالی تو گیس نے اپنا کام دکھایا اور اگلی شام اُس کے ہاتھوں پر آبلے پڑ گئے۔

جب اِس واردات کی خبر اِنسپکٹر وِلیَم کو ملی تو اُس نے اپنے چیف سے رابطہ کیا' جس نے شہر کے تمام ہسپتالوں میں یہ پیغام بھجوا دیا کہ کوئی بھی ایسا آدمی جس کے ہاتھ پر آبلے ہوں' علاج کے لیے آئے تو فوراً قریبی تھانے میں اِطّلاع دیں۔

اگلے دن ایک کلینک سے اِطّلاع ملی کہ ایک ایسا شخص ہمارے پاس آیا ہے جس کے ہاتھوں پر آبلے ہیں اور وہ تکلیف سے بے حال ہے۔ یہ اِطّلاع اِنسپکٹر وِلیَم تک پہنچی تو وہ فوراً اُس جگہ پہنچ گیا۔ جب پاشی کا میڈیکل چیک اَپ ہوا تو یہ ثابت ہو گیا کہ یہ چھالے اُسی گیس سے پڑے ہیں' جو ٹیلی فون بُوتھوں کی مشینوں میں ڈالی گئی تھی۔ یوں وہ جیل پہنچ گئے۔

دُنیا کا ہر مُجرِم' چھوٹا ہو یا بڑا' اُس وقت تک اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے' جب تک وہ اپنی سُسرال (جیل) نہیں پہنچ جاتا یا پھر پولیس مقابلے میں نہیں مارا جاتا۔

****

تن دُرُستی

جسم کو تن دُرُست و توانا رکھنے کے لیے اچھی غذا کھانا چاہیے' اور اچھی غذا وہ ہے جس میں جسم کو قوّت دینے والی چیزیں شامل ہوں۔ شکر' نشاستہ اور روغن یا چکنائی قوّت بخش چیزیں ہیں۔ یہ آپ کے جسم کو کام کرنے اور کھیل کود کے لیے توانائی (یا ایندھن) مُہیّا کرتی ہیں۔ سیب میں شکر ہوتی ہے' روٹی میں نشاستہ ہوتا ہے' دودھ' مکّھن اور گھی میں چکنائی ہوتی ہے۔

پروٹین والی غذائیں جسم کو بڑھاتی اور اِس کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرتی ہیں۔ گوشت اور مکّھن میں پروٹین ہوتی ہے۔ اِس طرح دودھ بھی پروٹین سے مالا مال ہوتا ہے۔ معدنی اشیا (مِنرل) اور وائٹامن بھی قوّت بخش چیزیں ہیں۔ یہ دوسری قوّت بخش اشیا کو اپنا کام کرنے میں مدد دیتی ہیں اور جسم کو بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ روٹی' مکّھن' دودھ اور پھلوں میں مُختلف معدنی اشیا اور وائٹامن ہوتے ہیں۔ آپ کو اپنی روز مرّہ کی غذا میں اِن چیزوں کو ضرور شامل کرنا چاہیے۔ اِس طرح آپ کے جسم کو مُتوازِن غذا ملے گی اور آپ تن درست و توانا رہیں گے۔

وائٹامن بھی صِحت کے لیے بہت ضروری ہیں۔ آپ کو ایسی چیزیں ضرور کھانی چاہئیں جن میں ہر قسم کے وائٹامن ہوں۔ بعض وائٹامن ہڈّیوں اور دانتوں کو مضبوط کرتے ہیں' بعض جِلد اور خون کو صِحت مند رکھتے ہیں اور بعض نظر کے لیے بہت مُفید ہیں۔

سُندر بن کا آدم خور

عبدالرشید فاروقی

یُوسُف کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر دادا جان نے اسے اپنے قریب بلایا اور بولے "آگئے' بیٹے۔ کہو' آج کا دن کیسے گزرا؟"

یوسُف نے مسکرا کر دادا جان کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "دادا جان آج اِسکول میں ایک دل چسپ بات ہوئی"۔

"دل چسپ بات؟" دادا جان بولے۔

"جی ہاں۔ تفریح کے وقت ہم میدان میں کھیل رہے تھے کہ یکایک ایک گھنے درخت کے قریب ایک سانپ دکھائی دیا۔ سب لڑکے ڈر کر چیخنے چلّانے لگے۔ سانپ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر لڑکے بے حد خوف زدہ تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں پورا اِسکول میدان میں جمع ہوگیا۔ ٹیچر بھی آگئے' مگر۔"

یوسف خاموش ہوا تو دادا جان نے جلدی سے پوچھا "مگر کیا؟"

"مگر کوئی بھی سانپ کو مارنے کی ہِمّت نہیں کر رہا تھا۔ وہ بڑے مزے سے رینگ رہا تھا۔ میں نے اپنے کلاس فیلو' عدنان' سے کہا کہ بھئی' تم اِتنے بہادر ہو۔ اِسے ہلاک کیوں نہیں کرتے۔ پتا ہے' دادا جان' اس نے کیا جواب دیا؟ کہنے لگا کہ میں نے سانپ کبھی نہیں مارا۔ میں نے اور بھی کافی دوستوں سے کہا لیکن کوئی آگے نہیں بڑھا۔ ٹیچر بھی کچھ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ آخر میں نے اُسے مارنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن سر گھبرا کر کہنے لگے "تم ..... تم اِسے مار گے؟" میں نے کہا "جی ہاں' میں اِس کو ماروں گا"۔ اور پھر دادا جان' میں نے اُسے مار دیا۔ ایک نوک دار پتھر سے اُس کا سر کچل کر رکھ دیا۔ سانپ کے مرتے ہی لڑکوں نے مجھے کندھوں پر اُٹھالیا اور نعرے لگانے لگے"۔ یوسُف بات ختم کرکے ایسے ہانپنے لگا جیسے میلوں کا سفر کرکے آیا ہو۔

دادا جان نے اسے شاباشی دی اور بولے "اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ تم ایک بہادر لڑکے ہو۔ لیکن تمھارے ابا جان میری بات کا یقین نہیں کرتے۔ شام کو جب انھیں معلوم ہوگا تو کتنا لطف آئے گا۔"

یوسُف مسکرانے لگا۔ پھر بولا "دادا جان' کل رات آپ کہ رہے تھے کہ آپ نے جوانی میں ایک شیر کو ہلاک کیا تھا"۔

"بے شک' میں نے ایک شیر کو ہلاک کیا تھا" دادا جان نے جواب دیا۔

"کیا آپ وہ واقعہ مجھے نہیں سنائیں گے؟" یوسف نے پوچھا۔

"ضرور سُناؤں گا' لیکن ابھی نہیں۔ تم تھکے ہوئے اِسکول سے آئے ہو۔ تمھیں بھوک بھی ستارہی ہوگی۔ پہلے یُونی فارم بدلو' پھر کھانا کھاؤ اور اِس کے بعد تھوڑا آرام

کرو" دادا جان نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔
"آرام کیا تو پھر شام ہو جائے گی" یُوسُف نے مُنہ بنا کر کہا۔
"شام ہونے سے کیا ہوتا ہے" دادا جان مسکرائے۔
"شام کو آپ اپنے دوستوں کے ساتھ پارک میں چلے جاتے ہیں"۔
"تم نے ٹھیک کہا۔ مگر آج کی ساری شام تمہارے ساتھ گزرے گی؟" دادا جان نے کہا تو یوسف مسکرانے لگا۔
شام کے وقت دونوں دادا پوتے پارک میں بیٹھے تھے۔ باتیں کرنے کے لیے انہوں نے ایک الگ تھلگ جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ موسم بے حد خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا جسم اور روح کو عجیب سا سُرُور بخش رہی تھی۔
"ہاں، دادا جان۔ اب سُنایئے، وہ واقِعہ۔ آپ نے شیر کو کیسے ہلاک کیا؟" یوسف نے پوچھا۔
دادا جان نے پیار بھری نظروں سے یُوسُف کی طرف دیکھا، پھر کہنے لگے "بیٹے، یہ 1962ء کی بات ہے۔ میں اُن دِنوں اپنے ایک بنگالی دوست سے ملنے مشرقی پاکستان گیا ہُوا تھا۔ وہ سُندربَن کے قریب ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ سُندربَن بنگلہ دیش کا بُہت بڑا اور بہت گھنا جنگل ہے۔ اِس میں دوسرے جانوروں کے عِلاوہ شیر اور چیتے بھی پائے جاتے ہیں۔ خیر تو، ہمارے دن ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ اچانک گاؤں میں ایک عجیب واقِعہ ہوا"۔
دادا جان کہتے کہتے رُک گئے۔ پھر یُوسُف کو پوری طرح چوکس دیکھ کر اُنھوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا "گاؤں کا ایک آدمی غائب ہوگیا۔ وہ گاؤں کے آخری سرے پر، جنگل کے قریب، اپنے کھیت میں کام کررہا تھا۔ پورے گاؤں نے مل کر اُسے بُہت تلاش کیا مگر وہ کہیں نہ ملا۔ پھر یہ سوچ کر لوگوں نے دل کو تسلی دی کہ ممکن ہے کہ وہ کسی کام سے شہر چلا گیا ہو۔ لیکن تین دن گزرنے پر بھی وہ واپس نہ آیا تو اس کے گھر والوں کا برا حال ہوگیا۔ گاؤں والوں نے انہیں بُہیتری تسلّیاں دیں مگر انہیں کسی کل چین نہ تھا۔
"یُوسُف بیٹے، ابھی لوگ اِس واقعے کو بھولے نہیں تھے کہ ایک روز ایک اور آدمی غائب ہوگیا۔ اب تو لوگوں کو بہت فکر ہوئی۔ کیا مرد کیا عورت، سب ہی پریشان اور فکرمند تھے۔ نوجوانوں نے اردگرد کے گاؤں کھنگالے، مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان دونوں کو زمین نے نگل لیا ہو۔
"ہر روز، شام کے وقت، لوگ چوپال میں جمع ہوتے، اندازے لگائے جاتے، مگر کچھ نتیجہ نہ نکلتا۔ پتا نہیں دونوں آدمی کہاں غائب ہوگئے تھے! ایک خوف تھا جو گاؤں والوں کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا۔
"وہ ایک سہانی شام تھی، جب لوگوں کا ایک گروہ میرے پاس آیا۔ ان کے لٹکے ہوئے پریشان چہرے دیکھ کر میں نے اندازہ کرلیا کہ ایک اور آدمی غائب ہوگیا ہے۔ میرا اندازہ دُرُست نکلا۔ واقعی نذرُل کمہار غائب ہوگیا تھا۔ بے چارہ دوپہر کے وقت برابر والے گاؤں میں برتن فروخت کرنے گیا تھا اور شام تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ میں فوراً ان کے ساتھ چل پڑا۔
"چوپال میں پہلے ہی بُہت سے لوگ موجود تھے اور سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ آخر طے کیا گیا کہ گاؤں کے تمام نوجوان مِل کر اِن گُم شُدہ لوگوں کا سُراغ لگائیں گے۔ لوگ میری عِزّت کرتے تھے اور میری باتوں کو اہمیّت دیتے تھے۔ چُناں چہ میں نوجوانوں کا لیڈر مُقرّر ہوا اور پھر ہم نے اپنا کام شروع کردیا۔ ہم نے اِردگِرد کے تمام گاؤں اچھی طرح دیکھ ڈالے، مگر غائب ہونے والے آدمی کہیں نہ ملے۔
"وہ دوپہر کا وقت تھا، جب ہم بیس کے قریب نوجوان جنگل میں گھوم رہے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے اور کُلہاڑیاں تھیں بندوق گاؤں بھر میں کسی کے پاس نہ تھی۔ ہم لوگ چھوٹے بڑے ٹیلوں اور جھاڑیوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایک بُہت گھنی جھاڑی کو دیکھتے

ہوئے میری نظر کپڑے کے چیتھڑوں پر پڑی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو یہ چیتھڑے دکھائے تو انھوں نے کہا کہ یہ نذرل کے کپڑے ہیں۔

"دوستو! یہ چیتھڑے ظاہر کر رہے ہیں کہ نذرل اب اِس دنیا میں نہیں ہے۔ اور یہ دیکھو، ان پر خون کے دھبے بھی ہیں" میں نے کہا۔

"یعقوب بھائی، اِس کا مطلب ہے کہ ــــــ" ایک نوجوان کہتے کہتے رُک گیا۔

"ہاں، تمھارا خیال دُرست ہے۔ کوئی درندہ لوگوں کا دُشمن ہوگیا ہے" میں نے کہا۔ میری بات سن کر سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"ہاں، یہ کسی درندے ہی کا کام ہے۔ اور یقیناً وہ درندہ شیر ہی ہوگا۔ میں نے آدم خور شیروں کی بے شمار کہانیاں پڑھی ہیں" میں نے کہا۔

"یوسُف بیٹے، جب گاؤں والوں کو پتا چلا کہ کوئی آدم خور شیر لوگوں کو غائب کر رہا ہے تو وہ اور خوف زدہ ہوگئے۔ بہرحال، ہم نوجوانوں نے اس آدم خور شیر کو ہلاک کرنے کا پروگرام بنایا۔

"اس رات، جب آسمان پر چاند پوری طرح روشن تھا، ہم جنگل کے اس حصّے میں چھُپ گئے، جس سے کچھ فاصلے پر گاؤں تھا۔

"ہمارا خیال تھا کہ شیر جنگل سے نکل کر جیسے ہی گاؤں کی طرف بڑھے گا، ہم اس پر ڈنڈوں اور کلہاڑیوں سے حملہ کردیں گے۔

"بیٹے، آج اپنے اِس منصوبے کا ذکر کرکے مجھے ہنسی آتی ہے۔ بھلا ایسے بھی کسی آدم خور شیر کو مارا جاتا ہے۔ پوری رات انتظار میں بیت گئی۔ شیر نہیں آیا۔

"اگلے دن مجھے شیر پکڑنے کی ایک ترکیب یاد آئی جو میں نے شکار کی کسی کہانی میں پڑھی تھی۔ ترکیب بہت زور دار تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ ہمیں کام یابی ہوگی۔ ہم نے دوپہر کے وقت، جنگل کے پاس، ایک بہت بڑا اور بہت گہرا گڑھا کھودا اور اس پر باریک باریک تیلیوں کی کم زور چھت ڈال دی۔ پھر گڑھے کے اس کنارے پر جو گاؤں کی طرف تھا، ایک موٹی تازی بکری باندھی اور ہم چار نوجوان، گڑھے کے قریب، ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔

ہماری نظریں جنگل کی طرف تھیں اور مجھے پورا یقین تھا کہ شیر ضرور آئے گا۔ ہمیں انتظار کرتے آدھ گھنٹا گزرا تھا کہ ہمیں شیر جنگل میں سے نکلتا دکھائی دیا۔ وہ بڑے چوکنّے انداز میں اُس گڑھے کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے دوسری طرف بکری بندھی ہوئی تھی۔ وہ گڑھے سے دس پندرہ فٹ دور تھا تو اُس نے ایک دم اپنے جسم کو پیچھے کی طرف سُکیڑا اور بکری کی طرف چھلانگ لگا دی۔ لیکن ہماری توقع کے مُطابق، وہ گڑھے کے کنارے پر، بکری کے پاس، گرنے کی بجائے گڑھے کی چھت پر گرا اور گڑھے نے اُسے نگل لیا۔

"یہ دیکھ کر ہم چاروں جلدی سے نیچے اُترے اور گڑھے کے قریب پہنچے۔ شیر غصّے سے دہاڑ رہا تھا۔ اُس وقت اُس کی حالت دیکھنے والی تھی۔

"یعقوب بھائی، جلدی سے اِسے ہلاک کر دو۔ ایسا نہ ہو یہ باہر نکل آئے۔" ایک نوجوان نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ گڑھے کی گہرائی اتنی ہے کہ یہ باہر نہیں نکل سکتا" میں نے کہا "تم ابھی، اسی وقت، شہر جاؤ اور کسی ایسے آدمی کو بُلا کر لے آؤ جس کے پاس بندوق ہو۔"

اُسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ پورا گاؤں ہماری طرف بھاگا آرہا تھا۔ ایک نوجوان نے مجھے کندھوں پر بٹھا لیا۔ گاؤں والے میرے گِرد خوشی سے ناچنے لگے"۔ اتنا کہہ کر دادا جان خاموش ہوگئے۔

"واہ! دادا جان۔ آپ نہ صرف بہادر تھے بلکہ ذہین بھی" یوسُف نے بڑے جوش سے کہا۔

"کیا مطلب؟ میں اب بہادر اور ذہین نہیں ہوں؟" دادا جان کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ یوسُف کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔

تاج انصاری

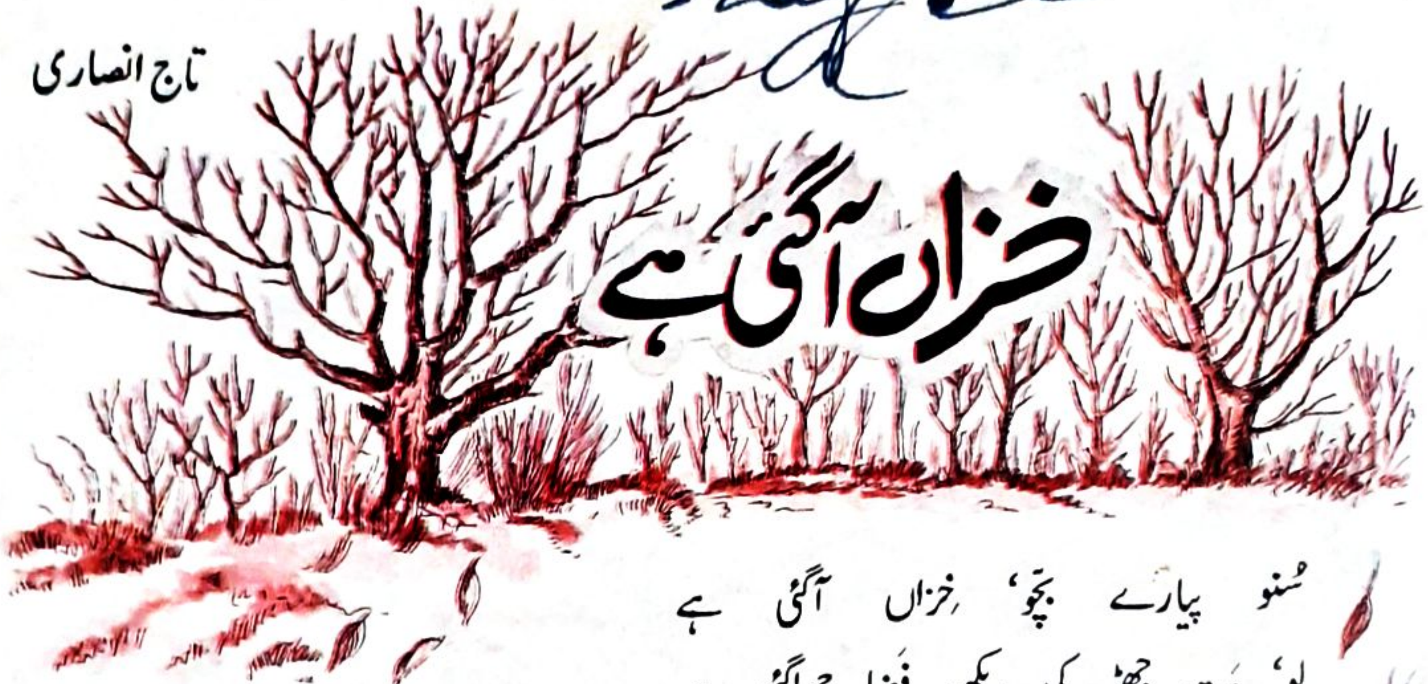

خزاں آگئی ہے

سُنو پیارے بچّو، خزاں آگئی ہے
لو، پت جھڑ کی دیکھو فضا چھا گئی ہے

کھڑے سب ہیں سہمے شجر ڈر کے مارے
عجب وقت آیا ہے گُلشن پہ سارے

نہ گُل ہیں، نہ کلیاں، نہ سبزہ ہرا ہے
وہ دیکھو، سبھی باغ اُجڑا پڑا ہے

لبادہ جو اوڑھا تھا اِک اِک شجَر نے
کیا اُن کو عُریاں[1] خزاں کے اثر نے

نہ طوطے نے گلشن میں ٹَیں ٹَیں مچائی
نہ بُلبُل بغیچے میں ہے چہچہائی

صدا قمریوں کی، نہ کوئل کی کُو کُو
پتّے ہیں بِکھرے، گُلِستاں میں ہرسُو

چمن میں کھڑا ہر شجَر خاک اُڑائے
ہے وِیرانی ایسی کہ دِل تھرتھرائے

یُوں چھائی ہے بے رونقی سی چمن میں
گُلِستاں کا مالی بھی روتا ہے من میں

(1) ننگا

آموں کی پیٹی

رعنا خیری

سکندر اور مونا اِسکول سے گھر پہنچے تو اُنہوں نے دیکھا کہ برآمدے میں امّی، دادا جان، دادی جان، چھوٹی پھوپھو اور اُن کا بنگالی مُلازِم، نورُ اِسلام، بیٹھے ہیں اور کوئی گرما گرم بحث چل رہی ہے۔

"آگئے، میرے بچّے" دادا جان نے محبّت سے کہا اور دونوں کو بڑھ کر گلے لگا لیا۔

"توبہ! توبہ! کیسی گرمی ہے۔ چیل انڈا چھوڑتی ہے" دادی جان بولیں "بچّے بے چارے ہلکان ہوگئے ہوں گے۔ اے دُلہن، کھانے میں کتنی دیر ہے؟"

"بس، اماّں جان، لگاتی ہوں" امّی بولیں "اِس جھنجھٹ میں خیال ہی نہیں رہا کہ کھانا لگانا ہے اور تین بج گئے ہیں۔"

"چلو نُور، جلدی سے آم دھو کر بالٹی میں ڈالو۔ ساتھ ہی برف بھی ڈالنا تاکہ جلدی ٹھنڈے ہوں" پھوپھو نے کہا۔

"آم؟ کہاں ہیں؟" مونا خوشی سے چیخ اُٹھی۔ اُسے آم بہت پسند تھے۔

"یہ کیا رکھے ہیں، اِدھر" پھوپھو نے ایک طرف اِشارہ کیا، جہاں ایک درمیانہ سائز کی پیٹی رکھی تھی۔

"واہ! یہ تو پوری پیٹی ہے۔ مزہ آگیا!" سکندر بولا۔ اُسے بھی آم بہت پسند تھے "اب خوب مزے لے لے کر کھائیں گے۔ مگر ہیں کون سے؟ لنگڑے یا فجری؟"

"اللہ کرے گول مٹول ہوں" مونا بولی۔

سب ہنس پڑے "گول مٹول نہیں، بیٹا، انور رٹول" دادا جان نے کہا۔

"خیر، کوئی سے بھی ہوں، بس آم ہوں، اور خوب ڈھیر سارے ہوں" پھوپھو بولیں "آم تو سب ہی مزے کے ہوتے ہیں"۔

"کون لایا؟" سکندر نے پوچھا۔

اِس سوال پر سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہی ہم معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جب تم لوگ آئے" امّی بولیں

"کیا مطلب؟" سکندر حیران ہو کر بولا "یعنی کسی کو پتا ہی نہیں کہ آم کون لایا ہے؟"

"نہیں" پھوپھو نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ یہاں کیسے آئے؟"

"سوٹا شاب (چھوٹا صاحب)، اَم آپ کے آنے سے جرا دیر پہلے باہر نکلا تو دیکا یہ پیٹی دروازے کے پاس پڑا تھا۔ اَم اُٹھا کر لے آیا" نُور اِسلام نے کہا۔

"کہیں ابّو تو نہیں لائے تھے؟" سکندر بولا۔

"بیٹا" وہ لائیں گے تو کیا اِس طرح دروازے پر چھوڑ جائیں گے؟ اور پھر وہ تو شام کو آتے ہیں" دادا جان نے کہا۔

"شاید چچا جان لائے ہوں" مُونا بولی۔

"نہیں، بھئی۔ گھر کا کوئی آدمی بھلا دروازے پر کیوں رکھے گا۔"

"کسی نے پیٹی کھول کے بھی دیکھی؟" سکندر نے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسا ہی بند پڑا ہے" نور بولا۔

"تو پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ اِس میں آم ہیں؟"

"ارے بھئی، آم کی بِھینی بِھینی خوش بُو فضا میں محسوس نہیں ہو رہی؟"

"چلیں، امّی، کھانا کھائیں۔ پھر آم کھائیں گے" مُونا بولی۔

"نور، آموں کو بالٹی میں ڈال دو" دادی جان نے کہا۔

"نہیں" دادا جان بولے "جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ آم کہاں سے آئے ہیں اور کون لایا ہے، اِنہیں کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ کیا پتا، کس کے ہوں"۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اگر ہمارے نہیں ہیں تو پھر کس کے ہیں؟" دادی جان نے کہا۔

"خیر، کوئی انہیں ہاتھ نہ لگائے، جب تک صحیح پتا نہ چل جائے" دادا جان نے حکم دیا۔ آخر "کھانا لگ گیا" کی صدا نے اِس بحث کو ختم کر دیا۔

سکندر اور مُونا کو کھانے کے دوران میں رہ رہ کے یہی افسوس ہو رہا تھا کہ وہ کھانے کے بعد آم نہیں کھا سکیں گے۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے اپنی خواہش کا اِظہار کرنا چاہا تو دادا جان کی "ہُونہہ" نے اُنہیں خاموش کر دیا۔ دادا جان کہتے تھے کہ کھانے کے دوران میں باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

کھانے کے بعد مونا نے جو پہلی بات امّی سے کہی، وہ آموں کے مُتعلّق تھی "امّی، آم کب کھائیں گے؟"

"ہاں، امّی، بتایئے ناں، ہم آم کب کھائیں گے؟" سکندر بھی بولا۔

امّی نے اُن کے چہروں سے اُن کی بے چینی کا اندازہ لگا لیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولیں "جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ آم کہاں سے آئے ہیں اور کون لایا ہے"۔

"مگر امّی، ہمارا دِل تو اب چاہ رہا ہے" مُونا بولی۔

"مجھے معلوم ہے، بیٹا۔ مگر تھوڑا صبر کرو۔ تمہارے ابّو شام کو آئیں گے تو شاید کچھ پتا چلے" امّی نے نرمی سے کہا۔

شام کو عارِف صاحِب دفتر سے آئے تو مونا اور سکندر نے اُنہیں دروازے پر ہی گھیر لیا "ابّو، دیکھیں، ہمیں امّی آم نہیں کھانے دیتیں" مونا نے شکایت کی۔

"اور کیا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے" سکندر بولا "اتنی دیر سے ہمارا دل چاہ رہا ہے اور کوئی کھانے نہیں دے رہا"۔

"اچھا" عارف صاحِب نے اندر آتے ہوئے کہا "بھئی، ہمارے بچّوں کو آم کیوں نہیں کھانے دیتیں؟"

"السّلامُ علیکُم" اُن کی بیگم یعنی سکندر اور مونا کی امّی نے کہا "آم کھانے سے منع کون کرتا ہے۔ میں نے تو اِس لِیے منع کیا تھا کہ جب تک کسی چیز کے مُتعلّق یہ معلوم نہ ہو جائے کہ کون لایا ہے یا کہاں سے آئی ہے، اُسے چُھونا نہیں چاہیے"۔

"کیا مطلب" عارف صاحِب حیرت سے بولے "یہ قِصّہ کیا ہے؟"

"تو کیا، ابّو، یہ آم آپ نے نہیں بھیجے ہیں؟" سکندر اور مونا نے ایک ساتھ پوچھا۔

"نہیں، بھئی۔ میں نے تو نہیں بھیجے"۔

"ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آپ نے بھیجے ہوں گے"

"تسلیم آجائے تو شاید کچھ پتا چلے" دادی جان بولیں۔

اُسی وقت بچّوں کے چچا تسلیم اندر داخل ہوئے "السّلامُ علیکم" اُنھوں نے کہا "کیا بات ہے؟ آپ سب لوگ سر جوڑے کیوں بیٹھے ہیں؟"

"چچا جان، ہم لوگ آپ کا ہی اِنتظار کر رہے تھے" مُونا بولی "اور ہم نے ابھی تک آم نہیں کھائے"۔

"آم نہیں کھائے؟ کیا مطلب؟" چچا حیران رہ گئے "نہیں کھائے تو کیوں نہیں کھائے؟ اور اگر نہیں بھی کھائے تو میرا اِس سے کیا تعلّق ہے؟"

"تو کیا آپ بھی آم نہیں لائے؟" مونا روہانسی ہو کے بولی۔

"بڑی حیرت کی بات ہے! جب ہم میں سے کوئی بھی نہیں لایا تو یہ آئے کہاں سے؟" دادا جان بولے۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا" امّی نے سر جھٹکتے ہوئے کہا "آم نہ ہوگئے، وبالِ جان ہوگئے۔"

"یہ تو وُہی بات ہوگئی کہ ہم پیڑ گِن رہے ہیں، بجائے آم کھانے کے" چچا جان ہنس کے بولے۔

"واقعی، ہے تو سوچنے کی بات" ابّو نے کہا "آخر یہ کسی نہ کسی کے تو ہوں گے، اور کوئی نہ کوئی تو اِنھیں یہاں رکھ گیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون تھا اور کس کے لیے لایا تھا۔ اگر ہم لوگوں کے لیے لایا تھا تو اِس طرح چُپ چاپ کیوں چھوڑ کے چلا گیا؟"

"ارے، چھوڑیں اِس بحث کو" پُھوپُھو اُکتا کے بولیں "بس اللہ میاں نے ہمارے لیے بھیجے ہیں کہ کھاؤ، کھاؤ اور خوب کھاؤ۔ لہٰذا میں تو پیٹی کھولتی ہوں"۔

"ٹھہر جاؤ صفیہ! مجھے یاد پڑتا ہے، عارف میاں، تمھارے ایک دوست چودھری نواز نام کے ہیں اور اُن کے آموں کے باغات ہیں" دادی جان نے کہا۔

"ارے ہاں، امّاں" ابّو سیدھے ہو کے بیٹھ گئے "یاد آیا۔ بہت پہلے اُنھوں نے مجھے آموں کی پیٹیاں بھجوائی تھیں۔ ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ ہو سکتا ہے یہ بھی اُنھوں نے ہی بھجوائی ہو۔ میں ابھی پتا کرتا ہوں" ابّو نے اپنی ڈائری میں چودھری صاحب کا فون نمبر نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگے۔ سب لوگ اُن کے گرد جمع ہوگئے۔ سکندر اور مُونا کے چہروں سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی اچھی خبر کی اُمید کر رہے ہیں۔

"چودھری صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" ابّو نے نمبر ڈائل کرکے کہا۔ تھوڑی دیر بعد پھر بولے "ہیلو! کون؟ چودھری صاحب؟ السّلامُ علیکم .... میں عارف بول رہا ہوں، عارف قدیر۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ جی، یہاں بھی سب خیریت ہے۔ بس مصروفیت خاصی ہے .... اور بھابی اور بچے ٹھیک ٹھاک ہیں؟ جی ہاں، اللہ کا کرم ہے ..... گئے ہوئے تھے؟.... کہاں؟ .... آموں کے باغات؟" یہ سُنتے ہی سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے سکندر اور مُونا کے چہروں پر تو رونق سی آگئی۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ ابّو چودھری صاحب کی بات سُن رہے تھے۔ وہ بولے "چچ چچ۔ بڑا افسوس ہوا .... خیر...... اللہ بہتر کرے گا ..... اچھا چودھری صاحب، میں نے سوچا، بڑے دن ہوگئے ہیں خیر خیریّت معلوم ہوئے۔ آپ سے بات کی جائے۔ کبھی تشریف لائیے ناں ہمارے ہاں ..... اچھا ..... ضرور۔ خدا حافظ ....."

فون کا ریسور انھوں نے رکھا ہی تھا کہ سکندر بولا "دیکھا، چودھری صاحب نے بھجوائے تھے آم"۔

"اور آپ نے شکریہ بھی ادا نہیں کیا اُن کا" امّی بولیں۔

"بیٹے، یہ تم افسوس کس بات کا کر رہے تھے؟ سب خیریّت ہے ناں، ان کے خاندان میں؟" دادا جان نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں" ابّو بولے۔ پھر کہنے لگے "آم چودھری صاحب نے بھی نہیں بھجوائے"۔

"کیا؟ کیا؟" کئی آوازیں آئیں۔

"ہاں۔ وہ مجھے بتا رہے تھے کہ وہ کل پرسوں ہی اپنے آموں کے باغات سے واپس آئے ہیں۔ اِس سال اُن کے آموں کی فصل بالکل تباہ ہوگئی۔ مُشکل سے گِنتی کے آم نکلے ہیں۔ کہ رہے تھے کہ اگلی فصل اچھّی ہوئی تو اِن شاء

اللہ آپ کو بھیجوں گا"۔

"تو پھر..... تو پھر..... یہ آم کس نے بھیجے ہیں؟" چچا بڑبڑائے۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ محلے میں کسی کے لئے آئے ہوں اور ہمارے یہاں کوئی غلطی سے چھوڑ گیا ہو" امی نے خیال ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر وہی بات، بھلا بغیر اِطلاع ایسے کون اِس طرح چھوڑ جائے گا؟" ابو نے کہا۔

سب لوگ اِس گُتھی کو سُلجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور سکندر اور مونا ٹُکر ٹُکر اُن کا مُنہ تک رہے تھے۔ اِتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔

"نُور، دیکھنا۔ کون ہے" امّی نے آواز لگائی۔ چند لمحوں بعد نور دو پولیس والوں کے ساتھ اندر آیا۔

"کیا بات ہے؟ فرمائیے؟" عارِف صاحِب دروازے پر پہنچ گئے۔

"تکلیف کی مُعافی چاہتے ہیں۔ میرا نام اِنسپکٹر سجاد ہے۔ ہمیں معلوم کرنا تھا کہ آپ کے یہاں آج کوئی آموں کی پیٹی تو نہیں دے گیا؟"

"آموں کی پیٹی؟ جی ہاں" عارف صاحِب بولے "مگر کیوں؟"

"پہلے یہ بتائیے کہ پیٹی کو کھولا تو نہیں گیا؟" انسپکٹر سجّاد نے سوال کیا۔

"جی نہیں۔ مگر بات کیا ہے؟"

"دراصل ہمیں اِطّلاع ملی تھی کہ کچھ لوگ ہیروئن اِسمگل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اسے آموں کی پیٹی میں چُھپایا گیا ہے۔ ہم لوگ اُن کا تعاقُب کر رہے تھے کہ وہ ہمیں چکّر دے کر یہاں پیٹی چھوڑ گئے۔ ہم نے اُنہیں گرفتار کرلیا ہے"۔

"اچّھا، تو یہ قِصّہ ہے" عارِف صاحِب نے سُکون کی سانس لی "ہم بھی حیران پریشان تھے کہ یہ پیٹی کہاں سے ٹپک پڑی، جس کا نہ کوئی والی ہے نہ وارِث۔ اِنسپکٹر

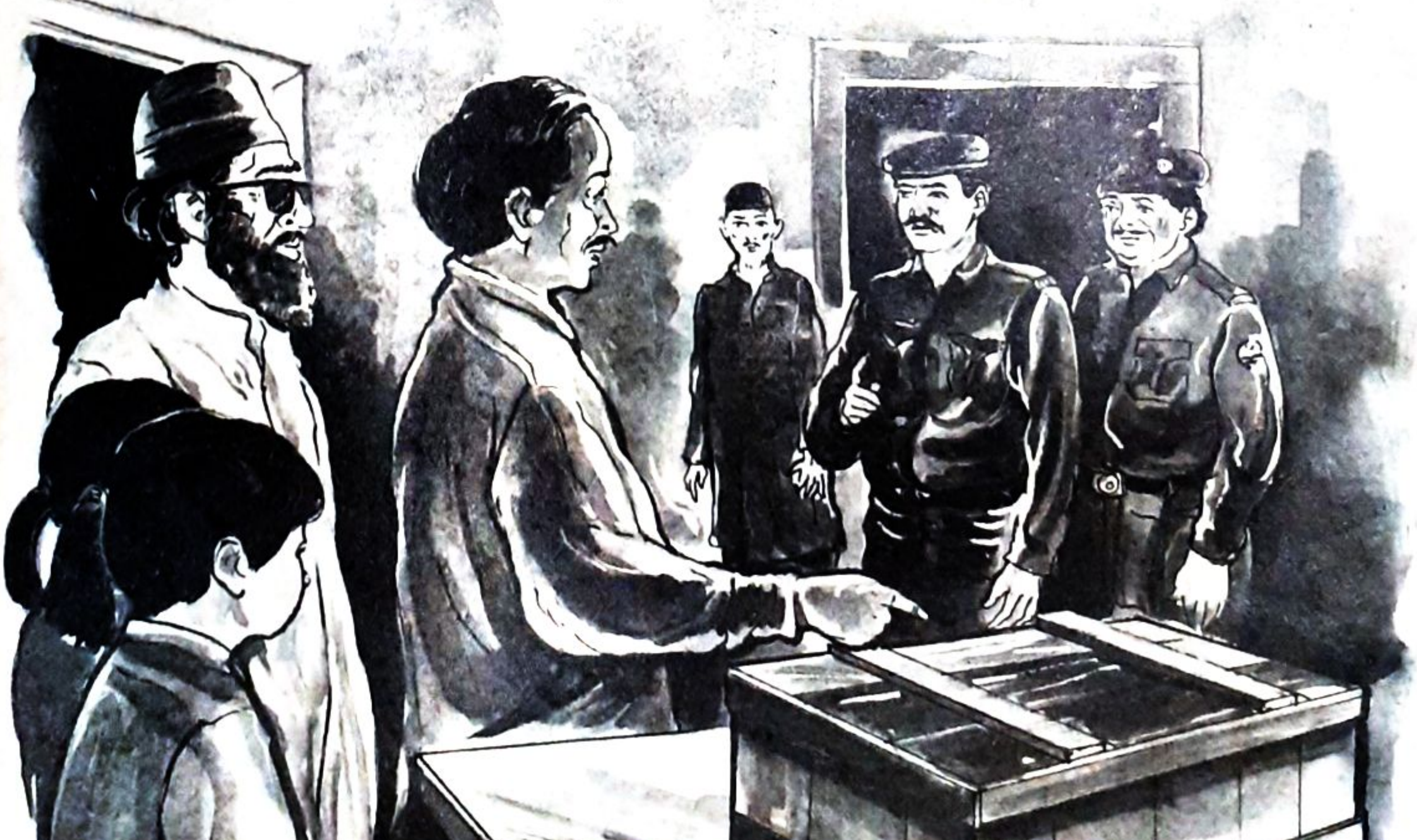

صاحب، وہ رہی آپ کی امانت۔ نُور، پیٹی اِنسپکٹر صاحِب کی گاڑی تک پہنچا دو۔ اور میرے لائق کوئی خدمت؟" عارف صاحِب نے اِنسپکٹر سے پوچھا۔

"فی الحال تو کچھ نہیں۔ بعد میں اگر، کیس کے سِلسلے میں، گواہی کی ضرورت پڑی تو تکلیف دیں گے" یہ کہہ کر اِنسپکٹر سجّاد ہنسا "پتا نہیں، لوگ گواہی دینے سے کیوں ڈرتے ہیں۔ بہرحال، اب اِجازت چاہُوں گا۔ خدا حافِظ"۔

"چلو بھئی، قِصّہ ختم ہُوا" امّی جان بولیں "شکر ہے ہم لوگوں نے پیٹی کھول نہ لی، ورنہ الٹا ہم پر ہی اسمگلنگ کا الزام لگ جاتا" چچا جان نے کہا۔

"ہاں، بھئی۔ شکر ہے، اللہ نے خیریّت رکھی" دادی جان نے کہا۔

"اُس وقت تو تم کہہ رہی تھیں کہ آموں کو بالٹی میں ڈال دو" دادا جان نے مسکرا کر دادی جان کو دیکھا۔ اُنہوں نے جھینپ کر مُنہ دوسری طرف کرلیا۔

مونا بے چارگی سے بولی "کتنا اچھا ہوتا اگر ہم آم کھالیتے۔ مگر امّی، اِتنی بڑی ہیروئن آم کی پیٹی میں کیسے آگئی؟"

"بیٹے، یہ فِلم والی ہیروئن نہیں ہے۔ دوسری ہیروئن ہے" ابّو نے سمجھایا۔

"اچھّا بھئی۔ میں ابھی اپنے بچّوں کے لیے آم لے کر آتا ہوں۔ خوب دل بھر کے کھانا" دادا جان نے مونا اور سکندر کے لٹکے ہوئے چہرے دیکھ کر کہا۔

"دادا جان، لنگڑا" سکندر نے آواز لگائی۔

"نہیں دادا جان، گول مٹول" مونا نے نعرہ لگایا۔ سب ایک دفعہ پھر ہنس پڑے۔

سیب

پھلوں کا بادشاہ

انگریزی کی مثل ہے ۔ An apple a day keeps the doctor away. مطلب یہ کہ سیب کھانے سے اِنسان تن دُرست رہتا ہے اور اُسے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ بات سوفی صد دُرست ہے۔ پھلوں میں سب سے مُفید پھل سیب ہی ہے، اور اِسے پھلوں کا بادشاہ کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔

بعض پھل بعض لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کے لیے نقصان دہ۔ مثلاً تُرش پھل (مالٹے، کنّو، موسمّی) بہت مُفید پھل ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے معدے میں تیزابیّت زیادہ ہے، اُن کے لیے یہ مُضِر ہیں۔ یہی حال آم کا ہے۔ آم گرم مزاج لوگوں کے لیے نقصان دہ ہے، اور شوگر کے مریضوں کے لیے تو زہر سے کم نہیں۔ لیکن سیب ایک ایسا پھل ہے جسے ہر شخص بلا تکلّف اِستعمال کر سکتا ہے۔

ایک اوسط درجے کے سیب میں 100 کلوریز (غذائی حرارے) ہوتے ہیں۔ اِس میں پانی کے عِلاوہ تھوڑی سی مِٹھاس، پروٹین، لوہا، فاسفورس اور مُختلِف وِٹامن (خاص کر وِٹامن C) کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں صِحّت کے لیے بہت مُفید ہیں۔

تازہ سیب کا اِستعمال اِنسان کو بہت سی بیماریوں سے بچاتا ہے۔ یہ جسم کو تر و تازہ رکھتا ہے، چہرے کا رنگ نِکھارتا ہے، خون کو صاف کرتا ہے، اور دل و دماغ کو طاقت دیتا ہے۔ اِس کا مُربّا، خمیرہ، حلوا اور شربت بھی صِحّت کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔

اگر آپ کا جِسم کم زور ہے، چہرہ مُرجھا یا ہُوا ہے، گال پچکے ہُوئے ہیں، بھوک کم لگتی ہے، پڑھنے لکھنے میں دِل نہیں لگتا، حافِظہ بھی اچھا نہیں تو روزانہ صبح کو نہار مُنہ ایک سیب (چھلکوں سمیت) کھایئے اور اُوپر سے ڈیڑھ پاؤ خالص دودھ پی لیجیے۔ چند ہی دنوں میں آپ کی صِحّت قابلِ رشک ہو جائے گی۔

آئیے مسکرائیں

ایک کلرک نے اپنے باس کو کھانے پر بلایا۔ کلرک اور اس کی بیوی نے اس کی خوب خاطر تواضع کی۔ صاحب بہت خوش ہوئے۔ کلرک نے سوچا، اب اس کی ترقی ہو جائے گی۔ جب صاحب کھانا کھا کر جانے لگے تو کلرک کا بچہ آیا اور کہنے لگا "ڈیڈی، یہ انکل اتنے موٹے تو نہیں ہیں۔ پھر آپ انہیں گینڈا کیوں کہتے ہیں؟" (محمد عباس خان بلوچ، گڈو بیراج)

استاد (رشید سے): تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟
رشید: جی، وہ وکیل ہیں۔
استاد (حمید سے): تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟
حمید: وہ ڈاکٹر ہیں۔
استاد (وحید سے): اور بھئی، تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟
وحید: جی، وہ وہی کرتے ہیں جو میری امی کہتی ہیں۔ (عاصمہ نیلم، اسلام آباد)

ماں (بیٹے سے): بیٹے، کیا کر رہے ہو؟
بیٹا: جغرافیے کے سوال حل کر رہا ہوں۔
ماں: کوئی سوال نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لینا۔
بیٹا: امی، دریائے نیل کہاں ہے؟
ماں: بیٹا، غسل خانے میں رکھا ہوگا۔ (محمد ساجد انصاری، ڈنگہ)

ایک پاگل ایک مینار پر چڑھ گیا۔ پاگل خانے کے ڈاکٹروں نے اسے اتارنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ نہ اترا۔ آخر انھوں نے ایک دوسرے پاگل کو بلایا۔

دوسرا پاگل بولا "نیچے اتر آؤ، ورنہ مینار کو قینچی سے کاٹ دوں گا"۔

پاگل فوراً نیچے اتر آیا۔ ڈاکٹروں نے اس سے پوچھا "ہمارے کہنے سے تو تم نیچے نہیں اترے۔ اس کے کہنے سے کیوں اتر آئے؟"

پاگل ہنس کر بولا "مجھے یقین تھا کہ آپ مینار نہیں کاٹیں گے۔ لیکن یہ تو پاگل ہے اس کا کیا پتا!" (سارہ صفدر، سرگودھا)

گاہک (ہوٹل کے بیرے سے): یہ روٹیاں تو جل کر سیاہ ہو گئی ہیں۔
بیرا: یہ جلی ہوئی نہیں ہیں، صاحب۔ آج ہمارے باورچی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کے سوگ میں کالی روٹیاں پکائی گئی ہیں۔ (ایم۔اے۔ مونی، رحمانی ٹاؤن لیاقت پور)

ایک پاگل ماچس کی تیلیاں جلا رہا تھا۔ اس نے پہلی جلائی تو نہیں جلی۔ دوسری جلائی تو نہیں جلی۔ تیسری جلائی تو وہ بھی نہ جلی۔ جب چوتھی جلائی تو وہ جل گئی۔ اس نے وہ تیلی بجھا کر جیب میں رکھ لی اور بولا "وہ تیلیاں تو خراب تھیں۔ اسے سنبھال کر رکھ لیتا ہوں۔ یہ کام آئے گی"۔ (شکیل احمد، واہ چھاؤنی)

عدالت میں دو وکیل آپس میں لڑ پڑے۔ ایک نے دوسرے سے کہا "تم سے بڑا گدھا آج تک میں نے نہیں دیکھا"۔

دوسرا وکیل بولا "اور تم سے بڑا گدھا آج تک میں نے بھی نہیں دیکھا"۔

جج میز پر ہتھوڑا مار کر بولا "آرڈر، آرڈر۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں بھی یہاں موجود ہوں!" (شکیل احمد، واہ چھاؤنی)

باتیں بڑوں کی

مرسلہ : فضلِ الٰہی، توحید آباد آزاد کشمیر

- اللہ کے دیے ہوئے پر راضی ہو جا، ورنہ کوئی ایسا مالک تلاش کر جو اُس سے زیادہ دے سکے۔ (حضرت داوٗدؑ)
- زیادہ باتیں کر کے اپنے آپ کو بے وقوف ثابت مت کرو۔ (حضرت عُمر فاروقؓ)

مرسلہ : ثمینہ سعید مُغل، رائے ونڈ

- دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو، تاکہ وہ تمہارے عیب تلاش نہ کریں۔ (ارسطو)
- میں خوش رہتا ہوں، کیوں کہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ (آئین سٹائن)

مرسلہ : صائمہ صدف، سرگودھا

- دوست ہزار بھی کم، اور دُشمن ایک بھی زیادہ ہے۔ (نصیرُالدّین طوسی)
- دولت کے بھوکے کو کبھی سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ (معروف کرخیؒ)
- کسی کا دل نہ دُکھا کہ تیرے پہلو میں بھی دل ہے۔ (ٹالسٹائی)

مرسلہ : سمیرا فرحین، سمن آباد لاہور

- دُنیا عاقل کی موت پر اور جاہل کی زندگی پر آنسو بہاتی ہے۔ (افلاطون)
- قسمت ہر دروازے سے پُوچھتی ہے "کیا عقل اندر ہے؟" (سسرو)

مرسلہ : طیّبہ سحر، لاہور

- درخت اپنے لیے نہیں، لوگوں کے لیے پھل دیتا ہے۔ (مارٹن لوتھر)
- بیماری میں مرجاؤ۔ احسان کی دوا مت کھاؤ۔ (خوش حال خان خٹک)

مرسلہ : خُرّم نواز رانجھا، گوجرہ

- اگر تم عقل مند ہو تو اپنے کانوں کو چھلنی نہ بناؤ، جو بھوسی رکھ لیتی ہے اور آٹا گرا دیتی ہے۔ (حضرت عیسیٰؑ)
- بے عمل عالم پارس پتھر کی مانند ہے جو اوروں کو تو سونا بنا دیتا ہے مگر خود پتھر کا پتھر رہتا ہے۔ (مُجدّدِ الف ثانیؒ)

مرسلہ : ندیم ارشد مرزا، سمن آباد لاہور

- خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ (شیخ عبدُالقادر جیلانیؒ)
- کسی سے بدلہ لینے میں جلدی نہ کرو، اور کسی سے نیکی کرنے میں دیر نہ کرو۔ (شفیق بلخی)

مرسلہ : زاہدہ پروین، سیال کوٹ

- اپنا کام دوسروں کی نکتہ چینی سے تنگ آکر بند نہ کرو۔ (بابا فریدؒ)

مرسلہ : شکیل احمد، واہ چھاؤنی

- عقل مند وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سُنے۔ (اُقلیدس)
- جو شخص علم حاصل کرنے میں مُشکلات نہیں جھیلتا، اسے ہمیشہ کے لیے جہالت کی ذلتیں سہنا پڑتی ہیں۔ (محمد علی جوہر)

مرسلہ : حبیب احمد صدّیقی، لیاقت آباد کراچی

- تقدیر ہمیشہ بہادروں کا ساتھ دیتی ہے۔ (ٹینی سن)
- خاموشی نفرت کے اظہار کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ (برنارڈ شا)

مرسلہ : کلثوم اختر (مقام کا نام نہیں لکھا)

- دیوار کا پتھر خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو، اپنی قیمت رکھتا ہے۔ (لانگ فیلو)

عقل کی فتح

زاہدہ پروین گوجرانوالہ چھاونی

خالد اپنے کمرے میں بیٹھا کل ہونے والے ٹیسٹ کی تیاّری کر رہا تھا کہ اچانک اُسے ایسا لگا جیسے کوئی اُن کے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اُس کے کمرے کا دروازہ کھُلا اور ایک شخص ہانپتا ہوا جلدی سے اندر گھُس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ خالد کو گھور رہا تھا۔ خالد اُسے دیکھ کر ڈر گیا۔ اُس کا حُلیہ بھی بہُت خراب تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ بال اُلجھے ہوئے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اُس کے گال پر زخم کا نشان بھی تھا جس سے اُس کا چہرہ اور خوف ناک ہو گیا تھا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ آخر خالد نے ہمّت کر کے پُوچھا، "کک۔۔کون ہو تم اور ۔۔۔یہاں کیوں آئے ہو؟"

اجنبی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بولا "پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ مجھے پناہ چاہیئے۔ مجھے کہیں چھُپا لو۔" اور پھر ایک دم اُس کا لہجہ بدل گیا۔ درخواست کی جگہ اُس کی آنکھوں میں بے رحمی نظر آنے لگی "اور اگر تم نے کوئی چالاکی دکھائی تو اِس ریوالور میں ابھی دو گولیاں موجود ہیں۔ تمھارے لِیے کافی ہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے ریوالور خالد کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

خالد نے پوچھا "لیکن پولیس آپ کے پیچھے کیوں لگی ہوئی ہے؟ آپ نے کیا جُرم کیا ہے؟"

"باتوں کا وقت نہیں ہے" اجنبی نے غُرّا کر کہا اور پھر الماری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے۔۔۔۔ میں یہاں چھُپ جاتا ہوں، اور تم کُرسی پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دو۔ لیکن یاد رکھو! میرے ریوالور کا رُخ تمھاری طرف ہو گا اور اگر تم نے اُنہیں کچھ بتانے کی کوشش کی تو میری گرفتاری سے پہلے تم اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

"ٹھٹھ ۔۔۔ ٹھیک ہے" خالد ہکلایا۔ وہ بہت خوف زدہ تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور کتاب کھول لی۔ بظاہر وہ کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اُس کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ مُجرِم پکڑا جائے۔ آخر اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ لیکن اُس پر عمل بہُت ہوشیاری سے کرنا تھا، ورنہ اُسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

کچھ دیر بعد اُس نے کتاب رکھ کر کاپی اور پین پکڑ لیا۔ اُسی وقت دھپ دھپ کی آوازیں آئیں۔ اُس کا ہاتھ تیزی سے کاپی پر کچھ لکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھُلا اور ایک اِنسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اِنسپکٹر نے خالد سے پُوچھا "بیٹا، یہاں کوئی شخص تو نہیں آیا تھا؟ اُس کے بال بِکھرے ہوئے، کپڑے پھٹے ہوئے اور گال پر زخم کا نشان ہے۔"

خالد نے بڑے سُکُون سے جواب دیا "نہیں، جناب۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔ میں تو یہاں بیٹھا ہوم ورک کر رہا ہوں۔ یہ دیکھیے کاپی، تاکہ آپ کو اِطمینان ہو جائے۔"

خالد نے کاپی انسپکٹر کی طرف بڑھائی۔

انسپکٹر نے سرسری طور پر کاپی کو دیکھا، لیکن پھر فوراً

ہی چونک اُٹھا اور دوبارہ وہ تحریر پڑھنے لگا جو خالد نے موٹے موٹے حروف میں لکھی تھی :

"وہ میرے پیچھے والی الماری میں چُھپا ہوا ہے' اور اُس کے ریوالور کا رُخ میری جانب ہے تاکہ میں آپ کو کچھ بتا نہ سکوں۔"

یہ پڑھ کر اِنسپکٹر نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا "بیٹا آپ کا کام بہُت اچھّا ہے۔ شاباش ! اب ہم چلتے ہیں۔"

اِنسپکٹر نے سپاہیوں کو اِشارہ کیا اور وہ سب باہر چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی مُجرم الماری سے نکلا اور خالد کے پاس آکر بولا "تم نے میری مدد کی۔ شکریہ۔ اب ......"

"ہینڈز اَپ" اُس کی بات جاری تھی کہ ایک کڑکتی ہوئی آواز آئی اور اُس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اِنسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا اور اُن کی رائفلوں کا رُخ اُسی کی طرف تھا۔

کچھ دیر تو وہ ہکّا بکّا کھڑا رہا' پھر آہستہ آہستہ ریوالور نیچے گرا کر ہاتھ اُوپر اُٹھالیے۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اُس کے ہتھکڑی لگا دی۔ اِنسپکٹر خالد کے پاس آیا اور بولا "یہ بہُت خطرناک مُجرم ہے۔ جیل سے فرار ہو گیا تھا۔ تمھارا بہُت بہُت شکریہ' بیٹے۔ تمھاری عقل مندی نے ایک خطرناک مُجرم کو پکڑوا دیا۔" اور خالد کا سر فخر سے اُونچا ہو گیا۔

(پہلا اِنعام : 50 رُوپے کی کتابیں)

پیرِس کی سیر

عمران ارشد' اِقبال ٹاؤن لیاقت پور

میرے انکل' کامران' جو پی آئی اے میں ملازِم ہیں' ہر سال کہیں نہ کہیں سیاحت کے لیے جاتے ہیں' اور اِس دفعہ اُن کا اِرادہ فرانس دیکھنے کا تھا۔ چوں کہ میں میٹرک کا اِمتحان دے کر فارغ تھا' اِس لیے اُنھوں نے میرا بھی ویزا لگوا دیا اور ہم تین جون کو پاکستان سے روانہ ہو گئے۔ تقریباً بارہ گھنٹے بعد ہم برِّاعظم یورپ کی حدود میں تھے۔ یورپ کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہم کو برف پوش پہاڑ نظر آئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے زمین پر سفید پینٹ کر دیا ہو۔ آخر ہم 14 گھنٹوں کے سفر کے بعد پیرس پہنچ گئے' جو کہ فرانس کا دارُالحکومت ہے۔ جیسے ہی ہم اِیئر پورٹ سے باہر نکلے' ہمیں سرد ہواؤں نے گھیر لیا اور ہمارے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔

دو دن تک تو بارش کی وجہ سے کہیں نہ جا سکے تیسرے دن جب آسمان صاف ہوا تو ہم سب سے پہلے آئفل ٹاور دیکھنے گئے۔ آئفل ٹاور کے راستے میں ہم اتوال چوک سے گزرے۔ یہ چوک فرانس کا سب سے بڑا چوک ہے۔ یہاں سے 16 بازار نکالے گئے ہیں اور اِس کا دروازہ بہُت خوب صورت ہے۔ یہاں سے تقریباً 20 مِنٹ بعد آئفل ٹاور پہنچ گئے۔ ہم دُنیا کے اِس بلند ترین ٹاور کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہم لِفٹ کے ذریعے اُس کے اُوپر تک گئے اور اُس کی چوٹی سے پُورے پیرس کا نظارہ کیا۔ اِس کے بعد ہم نے اُس کے اِردگِرد پھیلے ہوئے باغات کی سیر کی۔

پھر اگلے روز ہم باسٹیل دیکھنے گئے جو فرانس کا بہُت قدیم قلعہ ہے۔ یہ قلعہ پیرس سے تقریباً 500 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم راستے میں خوب صورت نظاروں سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے تقریباً 6 گھنٹوں میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ قلعہ سمندر کے اندر ہے اور اِسے سڑک کے ذریعے شہر سے ملایا گیا ہے۔ ہم نے وہاں سے ایک بھارتی گائڈ کو ساتھ لیا' جس نے ہمیں قلعے کی ایک ایک چیز دکھائی۔ قلعے کے اندر بہت سے تہ خانے اور سُرنگیں ہیں۔ اِس کے عِلاوہ یہاں ایک چھوٹا سا عجائب گھر بھی ہے جس میں قدیم نوادِرات رکھے گئے ہیں۔ قلعے میں ہر طرف قیدیوں پر تشدّد کرنے والے آلات لٹک رہے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے ہم نے اِس قلعے کی سیر کی' پھر ہم پیرس لوٹ آئے۔

اگلے روز ہم نے پیرس کا عجائب گھر دیکھا جو "لود" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں ہم نے سب سے زیادہ دل چسپی فرعون کی ممی میں لی' جو مصر سے لاکر یہاں رکھی گئی

ہی چونک اُٹھا اور دوبارہ وہ تحریر پڑھنے لگا جو خالد نے موٹے موٹے حروف میں لکھی تھی:

"وہ میرے پیچھے والی الماری میں چُھپا ہوا ہے، اور اُس کے ریوالور کا رُخ میری جانب ہے تاکہ میں آپ کو کچھ بتا نہ سکوں۔"

یہ پڑھ کر اِنسپکٹر نے اِطمینان کا سانس لیا اور بولا "بیٹا، آپ کا کام بہُت اچھّا ہے۔ شاباش! اب ہم چلتے ہیں۔"

اِنسپکٹر نے سپاہیوں کو اِشارہ کیا اور وہ سب باہر چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی مُجرِم الماری سے نکلا اور خالد کے پاس آکر بولا "تم نے میری مدد کی۔ شکریہ۔ اب......"

"ہینڈز اَپ" اُس کی بات جاری تھی کہ ایک کڑکتی ہوئی آواز آئی اور اُس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اِنسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا اور اُن کی رائفلوں کا رُخ اُسی کی طرف تھا۔

کچھ دیر تو وہ ہکّا بکّا کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ ریوالور نیچے گرا کر ہاتھ اُوپر اُٹھالیے۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اُس کے ہتھکڑی لگادی۔ اِنسپکٹر خالد کے پاس آیا اور بولا "یہ بہُت خطرناک مُجرِم ہے۔ جیل سے فرار ہوگیا تھا۔ تمھارا بہُت بہُت شکریہ، بیٹے۔ تمھاری عقل مندی نے ایک خطرناک مُجرِم کو پکڑوا دیا۔" اور خالد کا سر فخر سے اُونچا ہوگیا۔

(پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)

پیرِس کی سیر

عمران ارشد، اِقبال ٹاؤن لیاقت پور

میرے انکل، کامران، جو پی آئی اے میں ملازِم ہیں، ہر سال کہیں نہ کہیں سیاحت کے لِیے جاتے ہیں، اور اِس دفعہ اُن کا اِرادہ فرانس دیکھنے کا تھا۔ چوں کہ میں میٹرک کا اِمتحان دے کر فارغ تھا، اِس لِیے اُنھوں نے میرا بھی ویزا لگوا دیا اور ہم تین جون کو پاکستان سے روانہ ہوگئے۔ تقریباً بارہ گھنٹے بعد ہم برِاعظم یورپ کی حدود میں تھے۔ یورپ کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہم کو برف پوش پہاڑ نظر آئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے زمین پر سفید پینٹ کر دیا ہو۔ آخر ہم 14 گھنٹوں کے سفر کے بعد پیرس پہنچ گئے، جو کہ فرانس کا دارُالحکومت ہے۔ جیسے ہی ہم اِیئرپورٹ سے باہر نکلے، ہمیں سرد ہواؤں نے گھیر لیا اور ہمارے جِسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔

دو دن تک تو بارش کی وجہ سے کہیں نہ جا سکے۔ تیسرے دن جب آسمان صاف ہوا تو ہم سب سے پہلے آئفل ٹاور دیکھنے گئے۔ آئفل ٹاور کے راستے میں ہم اتوال چوک سے گزرے۔ یہ چوک فرانس کا سب سے بڑا چوک ہے۔ یہاں سے 16 بازار نکالے گئے ہیں اور اِس کا دروازہ بہُت خوب صورت ہے۔ یہاں سے تقریباً 20 مِنٹ بعد آئفل ٹاور پہنچ گئے۔ ہم دُنیا کے اِس بلند ترین ٹاور کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہم لِفٹ کے ذریعے اُس کے اُوپر تک گئے اور اُس کی چوٹی سے پُورے پیرس کا نظارہ کیا۔ اِس کے بعد ہم نے اُس کے اِردگِرد پھیلے ہوئے باغات کی سیر کی۔

پھر اگلے روز ہم باسٹیل دیکھنے گئے جو فرانس کا بہُت قدیم قلعہ ہے۔ یہ قلعہ پیرس سے تقریباً 500 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم راستے میں خوب صورت نظاروں سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے تقریباً 6 گھنٹوں میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ قلعہ سمندر کے اندر ہے اور اِسے سڑک کے ذریعے شہر سے ملایا گیا ہے۔ ہم نے وہاں سے ایک بھارتی گائڈ کو ساتھ لیا، جس نے ہمیں قلعے کی ایک ایک چیز دکھائی۔ قلعے کے اندر بہت سے تہ خانے اور سُرنگیں ہیں۔ اِس کے عِلاوہ یہاں ایک چھوٹا سا عجائب گھر بھی ہے جس میں قدیم نوادِرات رکھے گئے ہیں۔ قلعے میں ہر طرف قیدیوں پر تشدّد کرنے والے آلات لٹک رہے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے ہم نے اِس قلعے کی سیر کی، پھر ہم پیرس لوٹ آئے۔

اگلے روز ہم نے پیرس کا عجائب گھر دیکھا جو "لوو" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں ہم نے سب سے زیادہ دل چسپی فرعون کی ممی میں لی، جو مصر سے لاکر یہاں رکھی گئی

ہے- یہ عجائب گھر اِتنا بڑا ہے کہ ہم اُس دن اِسی کی سیر کر سکے- پھر ہم ہوٹل واپس آگئے-

دوسرے دن ہم نے سب سے پہلے پیرس کا قدیم شاہی محل دیکھا- یہ محل بہت بڑا اور فرانسیسیوں کی فنِ تعمیر میں مہارت کا نمونہ ہے- اِس کے اِرد گرد پھیلے ہوئے لان اور باغات اِس کے حُسن میں اِضافہ کررہے تھے-

محل کی سیر کے بعد ہم دریائے سین کی سیر کے لِیے گئے- دریائے سین کا پُرسکون پانی ہمارے اندر ایک ہلچل مچا رہا تھا- اِس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جہاز اور کشتیاں چل رہی تھیں- اِس کے بعد ہم نے پیرس کی مسجد دیکھی، جو بارسیں کے نام سے جانی جاتی ہے- پھر ہم ہوٹل واپس آگئے-

دوسرے روز ہم نے سب سے پہلے شانز سازی کا خوب صورت باغوں سے بھرا ہوا عِلاقہ دیکھا اور اُس کے ساتھ جو بازار ہے، وہاں خریداری بھی کی- یہاں موجود سرکاری دفتر اور صدر کا محل بھی دیکھا- اِس کے بعد ہم نے فرانس کی نیشنل لائبریری دیکھی- اِس کے اندر تقریباً ایک کروڑ سے زائد کتابیں رکھی گئی ہیں- آخری روز ہم نے پیرس کے چڑیا گھر کی سیر کی- یہاں قِسم قِسم کے جانور اور پرندے رکھے گئے ہیں، جنہیں دیکھ کر ہمیں خدا کی قدرت یاد آگئی- اِس کے عِلاوہ ہم نے سینٹ مالاں جو کہ فرانس کا دوسرا بڑا قلعہ ہے، کی بھی سیر کی- پھر ہم پاکستان واپس آگئے- (دوسرا اِنعام : 45 روپے کی کتابیں)-

ضرورت ہے ایک چوکیدار کی

رضوان اکرم، رحیم یار خان

قصّہ یوں ہے کہ ہماری قسمت کے ستارے گردش میں تھے- چُناں چہ ہمیں ضرورت پیش آگئی ایک عدد چوکیدار کی- آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ کیوں بھئی؟ تو صاحِب، یہ بات کچھ یوں شروع ہوئی کہ جولائی کی ایک گرم دوپہر تھی- ہم کمرے میں مزے سے سو رہے تھے کہ بیل ہوئی- باہر سخت گرمی تھی- سورج اپنی پُرانی دُشمنی نکال رہا تھا- ساتھ ہی لُو کے جھونکے رُوح کو گرما رہے تھے- ہر طرف گھُٹن اور حبس تھا-

ہم سوچ ہی رہے تھے کہ آنے والا اِنتظار کر کر کے چلا جائے گا، لیکن وہ ظالم تو شرط لگا کر آیا تھا کہ ہمیں باہر نکال کر ہی چھوڑے گا- آخر ہمّت کی، آئینے کے سامنے اپنے دو سینٹی میٹر بال دُرست کیے، چھتری لی اور باہر قدم رکھا- یقین کیجیے، ایسا محسوس ہوا جیسے بھڑکتے ہوئے الاؤ میں گر گئے ہوں- اُدھر وہ نامعقول تھا کہ گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا تھا- گیٹ تک پہنچتے پہنچتے ہماری ٹنڈ دہکنے لگی-

گیٹ کھولا تو ہمارے دوست خالد شریف کھڑے مسکرا رہے تھے- ہم کھول کر رہ گئے- مگر وہ بے نیازی سے ہنسے جا رہے تھے- پھر ایک دم اُنھوں نے زور سے چیخ ماری- غالبًا اُنھوں نے ہنسی روکی تھی- ہم نے بھنّا کر کہا "یہ ہنسنے کا کون سا موقع ہے؟ کیا دماغ کو گرمی چڑھ گئی ہے"؟ اُنھوں نے ہماری بات نظر انداز کر کے مسکراتے ہوئے کہا "تم چوکیدار کیوں نہیں رکھ لیتے؟ بار بار گیٹ پر آنے سے بچ جاؤ گے- وہ خود ہی مہمانوں کا اِستقبال کرے گا اور پھر تمہیں اِطّلاع کردے گا-"

ہم نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُنہیں چلتا کیا اور پھر گھر بھر میں اِعلان کردیا کہ جب تک چوکیدار نہیں آجاتا، ہم گیٹ پر نہیں جائیں گے- ہمارا یہ اِعلان پہلے تو گھر والوں نے مذاق سمجھا، پھر اُنھوں نے ہمیں سمجھایا، پیار سے، نرمی سے، سختی سے، ڈانٹ کر- لیکن جب اُنہیں یقین ہوگیا کہ ہم اپنے فیصلے کو نہیں بدل سکتے تو یہ کہہ کر ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیا کہ اوّل تو تمہیں تمہاری مرضی کا چوکیدار ملے گا نہیں، اور اگر مل بھی گیا تو تنخواہ سُن کر ہی تارے گنتے نظر آؤ گے-

اگلے دن ہی ہم نے تمام جاننے والوں اور نہ جاننے

والوں میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ "ضرورت ہے ایک چوکیدار کی۔" تین چار روز کے بعد اُمیدواروں کی آمد شروع ہو گئی۔ مگر وہ ہمارے معیار پر پورا نہ اُتر سکے۔ اُن میں سے بہت سے ایسے تھے جنہیں خود باڈی گارڈ کی ضرورت تھی۔ کوئی برسوں کا بیمار دکھائی دیتا مگر خود کو تیس مار خان بتاتا۔ کوئی شکل سے پیدائشی قصائی نظر آتا اور کہتا کہ چور میرے نام سے کانپتے ہیں۔ کوئی شکل کا دیو ہوتا تو عقل سے پیدل ہوتا۔ غرض ہماری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ گھر کے سب لوگ ہماری کارروائی دیکھتے اور مسکراتے ہوئے گزر جاتے اور ہم خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔

ہم قریب قریب مایوس ہو چکے تھے کہ آخر بھائی جان کو ہم پر ترس آگیا اور وہ ہمارے ساتھ کام میں شریک ہو گئے۔ اُسی شام گھنٹی بجنے پر ہم باہر آئے تو عجب تماشا دیکھا۔ ہمارا ایک دوست طاہر بُری طرح اُچھل کُود کر رہا تھا اور اُس کے مُنہ سے گھُٹی گھُٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے اُسے اِس مُصیبت سے نجات دلائی، کمرے میں لا کر بٹھایا، تسلّی دی اور پانی پلایا۔

آخر اُس کی ابھری ہوئی آنکھیں اندر چلی گئی، رگیں نارمل ہو گئیں، ٹانگوں کی لرزش کم ہو گئی اور سانس کی اِسپیڈ 100 سے واپس زیرو پر آگئی۔ سکُون کا سانس لیتے ہی اُس نے ہمیں خونی نگاہوں سے دیکھا اور کڑک کر بولا "عجیب لوگ ہیں آپ بھی۔ کُتّے رکھے ہوئے ہیں، مہمانوں کو بھگانے کے لیے۔ خواہ مخواہ عزّت خراب کراتے ہو۔ چوکیدار کیوں نہیں رکھ لیتے"؟

وہ بولتا رہا اور ہم اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ چوکیدار کا لفظ ہم سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ جب موڈ ٹھیک ہوا تو واپس گئے۔ طاہر کمرے میں نہ تھا۔ باہر گئے تو وہاں بھی نہ تھا۔ اچانک ہماری نظر سامنے گلی میں پڑی تو بے اِختیار قہقہہ چھوٹ گیا۔ طاہر یوں دوڑ رہا تھا جیسے اُس کے پیچھے کوئی بھوت لگ گیا ہو۔ ہم نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس کے پیچھے بھوت نہیں، ہمارے وہ کتّے لگے ہوئے ہیں جو پچھلے دنوں بھائی جان لائے تھے۔ اُنہوں نے ہی طاہر کا اِستقبال کیا تھا۔

جب کُتوں نے آنے والوں کو بہُت پریشان کیا تو بھائی جان ایک دن چوکیدار لے آئے۔ ہم نے اُس کا انٹرویو لیا۔ نام کیا ہے؟ کتنے پڑھے ہوئے ہو؟ سگرٹ وغیرہ کے عادی تو نہیں؟ صفائی کا خیال رکھتے ہو؟ نشانہ کیسا ہے؟ قانون کو کس حد تک جانتے ہو؟ وفادار ہو؟ تجربہ کتنا ہے؟ غرض اِنٹرویو مُکمّل ہوا۔ چوکیدار ہماری اُمّیدوں کے عَین مُطابِق تھا۔ اُسے رکھ لیا گیا۔ صبح کو چوکیدار کو ناشتا دینا ہماری ذمّے داری تھی۔ اِس کے عِلاوہ کھانا، کپڑے، ہفتہ وار چھُٹی، اچھّی کارکردگی پر اِنعام چوکیدار نے ہم سے منظور کروایا۔

کئی دن گزر گئے۔ چوکیدار نے کسی شکایت کا موقع نہ دیا۔ ایک دن صبح کو گھر میں خوب شور مچا۔ ہم میٹھی نیند سے بیدار ہوئے تو معلوم ہوا کہ چوکیدار صاحب امّی کے زیورات، ابُو کی جمع پُونجی، بندوق اور بستر سمیت رفُو چکّر ہو گئے ہیں۔ ہم نے کئی دفعہ ابّا جان کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ چوکیدار بھائی جان لائے تھے، مگر ہماری قسمت کہ ہمارے ستارے گردش میں تھے۔ ہماری کسی نے نہ سُنی اور سارے نقُصان کا ذِمّے دار ہمیں ٹھہرایا گیا۔

(تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)

کیا ایسا ممکن نہیں؟

عمران علی شاہ، نوشہرہ

اِسکول سے واپس آکر میں نے بستہ کندھے سے اُتارا اور کُرسی پر رکھ دیا۔ پھر باجی سے پوچھا "باجی، امّی اور ابُو کہاں ہیں؟"

باجی نے جواب دیا "اِئیر پورٹ گئے ہیں۔ روبینہ آنٹی آرہی ہیں۔"

یہ سُن کر میرا ذہن سات برس پہلے ماضی کی طرف

لوٹ گیا۔ روبینہ آنٹی ہماری قریبی رشتے دار تھیں۔ سات آٹھ برس پہلے وہ اور اُن کے خاوند کینیڈا چلے گئے تھے۔ اُن کا ایک بیٹا تھا جو میرا ہی ہم عُمر تھا۔ اُن کے آنے کا سُن کر میں بہُت خوش ہوا۔

روبینہ آنٹی کچھ دن ہمارے گھر رہ کر کراچی چلی گئیں۔ کراچی میں اُن کا اپنا مکان تھا اور وہ باقی زندگی پاکستان میں گزارنے کے لیے آئی تھیں۔ اُنہیں پاکستان سے بہُت مَحبّت تھی اور یہی مَحبّت اُنہیں پاکستان لے آئی تھی۔

چند ماہ بعد ہم نے کراچی جانے کا سوچا۔ آنٹی کے گھر کا پتا ہمارے پاس تھا۔ ہم اُن کے گھر گئے تو آنٹی نے بتایا کہ کراچی میں شروع کے چند ماہ تو بڑے اچھّے گزرے، پھر روشنیوں کا یہ شہر ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ بموں کے دھماکے، گولیوں کی تڑاتڑ، کیا کچھ تھا جو یہاں نہ ہُوا۔ ایک دن بازار سے آتے ہوئے انکل بھی کسی ظالم کی گولی کا شکار ہو گئے۔ پھر اُن کے بیٹے کو کسی نے اِغوا کر لیا اور بعد میں اُس کی لاش گلی کے نُکّڑ پر ملی۔

"یہاں تو بُری حالت ہے۔ تم کینیڈا واپس کیوں نہیں چلی جاتیں؟" امّی نے کہا۔

آنٹی غم گین ہو کر کہنے لگیں "کس مُنہ سے جاؤں؟ وہاں لوگ واپس آنے کی وجہ پوچھیں گے تو کیا بتاؤں گی؟ اِن واقعات کے باوجود مجھے پاکستان کی رُسوائی گوارہ نہیں۔"

ہم چند دن آنٹی کے گھر رہ کر واپس لوٹ آئے۔ آنٹی میرے ذہن میں کئی سوالات چھوڑ گئی تھیں۔ وہ لوگ جنہیں وطن کی مَحبّت یہاں کھینچ لائی تھی، یہاں اُن کے بھائیوں نے اُن کے ساتھ کیا کیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم سب سچّے پاکستانی بن جائیں اور اپنے وطن کو امن و سکون کا گہوارہ بنا دیں؟ (چوتھا اِنعام : 35 روپے کی کتابیں)

مالِ مُفت، دلِ بے رحم

عاصمہ رانی، لالہ رُخ (واہ چھاونی)

شام کا وقت تھا اور گرمیوں کی چُھٹیاں تھیں۔ ہم سب بہن بھائی صحن میں بیٹھے تھے کہ اچانک دروازے پر بیل ہوئی۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی دروازے کی طرف لپکے کہ شاید ابّو آ گئے ہیں۔ لیکن جب دروازہ کھولا تو سامنے ایک آدمی ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبّا لیے کھڑا تھا۔ وہ ڈبّا مجھے دیتے ہوئے بولا "آج میری بہن کا رِزلٹ آیا ہے اور وہ اچھّے نمبروں سے پاس ہو گئی ہے۔ یہ مٹھائی آپ کے لیے لایا ہوں۔"

ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے تھے جس کی بیٹی یا بہن نے میٹرک کا اِمتحان دیا ہو۔ پھر یہ سوچ کر کہ شاید ابّو کے دوست کی کوئی بیٹی ہو، مٹھائی کا ڈبّا لے کر اندر آ گئے اور وہ آدمی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

ہم نے امّی کو یہ واقعہ سُنایا، پھر ڈبّا کھولا اور سب بہن بھائی مزے لے لے کر مٹھائی کھانے لگے۔ امّی نے بہتیرا کہا کہ ڈبّا مت کھولو۔ شاید وہ واپس لینے آ جائے۔ لیکن ہم نے سُنی اَن سُنی کر دی اور آدھی مٹھائی کھا گئے۔ باقی امّی اور ابّو کے لیے رکھ دی۔

ہم مٹھائی کھا کر مُنہ صاف کر رہے تھے کہ دروازے پر دوبارہ بیل ہوئی۔ میں دروازے پر گئی تو دیکھا کہ وہی آدمی کھڑا ہے۔ وہی بات ہوئی جس کا امّی کو شک تھا۔ اُس آدمی نے مٹھائی واپس مانگی اور کہنے لگا کہ میں غلطی سے آپ کے گھر دے گیا تھا۔

یہ سُن کر شرم سے میرا سر جُھک گیا۔ فوراً اندر گئی اور ایک ہی سانس میں امّی کو ساری بات بتا دی۔ امّی نے مٹھائی کا ڈبّا اُٹھایا اور اُس آدمی کو دے کر دروازہ بند کر دیا۔

اُس دن کے بعد مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ اِس سے انسان کو شرمندگی اُٹھانی پڑتی ہے۔ مُفت کا مال سوچ سمجھ کر کھانا چاہیے۔ (پانچواں اِنعام : 30 روپے کی کتابیں)

☆☆☆☆

شکار اور شکاری

سلیم خان گمی

"واحِد وِرِک! میرے پاس آؤ" !

تیمُور ڈِکّا میرے افسر تھے۔ وہ سی آئی اے (جرائم کی تفتیش کرنے والا اِدارہ) کے اِنچارج سُپرنٹنڈنٹ تھے، اور سی آئی اے کا کام عام پولیس سے ہٹ کر ہے۔ عام پولیس عام قِسم کے مُجرِموں کو پکڑتی ہے، اور سی آئی اے کے لوگ پُرانے ڈاکو، قاتِل، چور لُٹیرے اور پیسہ حاصل کرنے کے لِیے اِغوا کرنے والے پُرانے پاپیوں کا کھوج لگاتی ہے۔

ہاں، ایک بات ہے۔ عام پولیس والے بھی اِن لوگوں کو پکڑتے ہیں اور شاباش اور سندیں حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات اِن کو نقد انعامات بھی ملتے ہیں۔ لیکن سی آئی اے کو صرف شہرت ملتی ہے۔ ہمارے مُتعلِق فرض کرلیا گیا ہے کہ سی آئی اے کے اہل کار بہت اِیمان دار اور بہت بہادُر ہوتے ہیں اور مُجرموں سے رشوت لے کر اُن کو چھوڑتے نہیں ہیں۔

میں جب تیمُور ڈِکّا کے کمرے میں پہنچا تو اُن کے سامنے فیکس پڑی تھی۔ وہ میز پر گُم صُم بیٹھے تھے اور مُنہ لٹکا ہوا تھا۔ لیکن گول مول چہرے پر افسُردگی کم اور نفرت زیادہ تھی۔

"پڑھ لو!" اُنھوں نے نفرت سے کہا۔

میں نے فیکس کی تحریر سیدھی کرکے سامنے رکھی، لیکن ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا تھا کہ ایس پی صاحِب نفرت سے بولے "خانو کھرل پاگل خانے سے بھاگ گیا ہے"۔

میں نے اپنی آنکھیں تحریر پر جمائے رکھیں اور تحریر پڑھنے لگا۔ تحریر ڈی آئی جی کی طرف سے تھی۔ لکھا تھا:

"لاہور کے تمام تھانوں اور سی آئی اے کے تمام دفتروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ خطرناک قاتل اور ڈاکو خانُو کھرل کو گرفتار کریں۔ اِس کام میں ذرا دیر نہ کی جائے۔ خانو کھرل

کو نُورا اُسترا بھی کہا جاتا ہے۔ اُس کی عمر 45 سال سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ جیل میں تھا۔ وہاں سے جھوٹ مُوٹ پاگل بن کر پاگل خانے میں آیا اور آج وہاں سے بھاگ گیا۔ قد پانچ فٹ دو اِنچ، دُبلا پتلا، کالی آنکھیں، کالے بال، نوکیلی مونچھیں۔ بھیس بدلنے میں ماہر ہے۔ جیل میں عمر قید کاٹ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ دُلاّ دس نمبریا اور رِلیفا مزنگیا بھی بھاگ گئے ہیں۔ دُلاّ دس نمبریا پانچ فٹ گیارہ اِنچ لمبا ہے۔ لمبوترا چہرہ، موٹی آنکھیں، گھنی دار مونچھیں۔ رِلیفا مزنگیا کا قد پانچ فٹ سات انچ ہے۔ موٹا اور بھدّا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ترشی ہوئی مُونچھیں، کان پر مُہاسا۔ حکم نامہ ختم"۔

میں نے فیکس پر دیا گیا ڈی آئی جی کا حکم نامہ پڑھا اور پھر کاغذ ایس پی کے سامنے رکھ کر کہا "سر، آپ نے تو کہا تھا کہ صرف خانو کھرل فرار ہوا ہے۔ اِس تحریر میں تو دُلّے دس نمبریے اور رِلیفے مزنگیے کے بھاگنے کی بھی اِطّلاع درج ہے"۔

"ہاں، خانو کھرل کے ساتھ دُلاّ اور رِلیفا بھی بھاگ نکلنے میں کام یاب ہوگئے ہیں۔ لیکن اصل مُجرِم تو خانُو کھرل ہے۔ باقی دو تو اُس کے ساتھی ہیں اور قدرے کم خطرناک ہیں۔ اگر خانو کھرل ایٹم بم ہے تو وہ دونوں دستی بم ہیں"۔

یہ کہ کر ایس پی صاحِب کمر سیدھی کر کے بیٹھ گئے اور بولے "میں چاہتا ہوں کہ تم اُن کو پکڑو، اِس سے پہلے کہ عام پولیس والے اُن کو پکڑلیں"۔

"کوشِش کرتا ہوں، سر" میں نے دِھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن ایک بات یاد رکھو۔ خانُو کھرل بہُت خطرناک مُجرِم ہے۔ قتل کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ تمھیں اپنا خیال رکھنا ہوگا۔ اور ہاں، خانُو کو زندہ گرفتار کرنے یا گرفتار کروانے کے لِیے حکومت نے 5 لاکھ روپے اِنعام رکھا ہے۔"

میں نے سوچا، اگر اپنا خیال رکھوں گا تو اُسے کیسے پکڑوں گا، اور اگر اسے پکڑا یا پکڑنے کی کوشش کی تو اُس کی گولی سے کیوں کر بچوں گا۔

"اُسے زندہ پکڑنا ہوگا۔ اگر زندہ ہاتھی لاکھ کا اور مُردہ ہاتھی سَوا لاکھ کا ہوتا ہے تو زندہ مُجرم سَوا لاکھ کا اور مُردہ مُجرِم ایک روپے کا ہوتا ہے" ایس پی صاحِب نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اِجازت لے کر 13 فٹ لمبے اور 10 فٹ چوڑے اُس کمرے میں آگیا، جہاں دو میزیں اور دو کرُسیاں پڑی تھیں۔ ایک میز میری تھی اور دوسری میز پر سَب اِنسپکٹر شاہد نذیر بیٹھتا تھا۔

"کیوں بُلایا تھا امریکی صاحب بہادُر نے؟" شاہد نذیر نے مُجھ سے سوال کیا۔ وہ تیمور ٹکا کو امریکی صاحب بہادُر کہتا تھا۔

"خانو کھرل، دُلاّ دس نمبریا اور رِلیفا مُزنگیا" میں نے کہا۔

"یہ حضرات کون ہیں؟" شاہد نے پوچھا۔

"لُٹیرے، ڈاکو اور قاتِل ہیں۔ پاگل خانے میں تھے۔ وہاں سے بھاگ گئے۔ ایس پی صاحِب کہتے ہیں کہ اُن کو فورًا پکڑو۔ میں ذرا اُن کا ریکارڈ دیکھوں جاکر"۔

میں نے کہا اور اُٹھ کر ریکارڈ روم کی طرف چل دیا تاکہ اُن بدمعاشوں کے مُتعلِّق کچھ معلوم کرسکوں۔ ریکارڈ روم میں جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ میں اُن کو کیسے پکڑوں گا۔ لاہور کے سینکڑوں پولیس والے اُن کو پکڑنے کے لِیے روانہ ہوچکے ہوں گے، ناکے لگ چکے ہوں گے اور پیدل اور کار سوار لوگوں کو شُبہ بھری نظروں سے دیکھ رہے ہوں گے۔

سیڑھیاں چڑھ کر میں ریکارڈ روم میں پہنچا۔ وہاں مٹّی میں اَٹی ہوئی الماریوں میں، مٹّی میں اَٹی ہوئی فائلیں پڑی تھیں۔ یہ بہُت بڑا کمرا تھا اور یہاں سینکڑوں مُجرِموں کا ریکارڈ، تصویروں سمیت، موجود تھا۔

"مجھے خانو کھرل، دلا دس نمبریا اور لیفا مزنگیا کی فائلیں درکار ہیں" میں نے ریکارڈ کیپر سے کہا۔

"آپ پنکھے کے نیچے بیٹھ جائیں۔ میں تلاش کر کے لاتا ہوں" ادھیڑ عمر کا ریکارڈ کیپر فائلیں لینے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تین فائلیں میرے سامنے تھیں۔ میں نے

رسید دی اور فائلیں اُٹھا کر اپنے دفتر میں لے آیا تاکہ مُطالعہ کروں۔

خانو کھرل کی فائل میں اُس کا دس سال کا ریکارڈ درج تھا۔ اِسی طرح دُلّے اور رطیفے کے کارنامے بھی دس سالوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ خانو اکیلا واردات نہیں کرتا تھا۔ اُس کے ساتھ دو یا تین وارداتیے ہوتے تھے۔ وہ بینک لوٹتا تھا' کارخانوں کے ملازموں کی تنخواہیں لے کر جانے والی گاڑیوں کو لوٹتا تھا' سیٹھوں اور اُن کے بچّوں کو اِغوا کرتا تھا تاکہ تاوان حاصل کرسکے۔ دُلّے اور رطیفے کے حالات بھی کچھ اِتنے اچھے نہ تھے۔

"اصل کام خانو کھرل کو پکڑنا ہے" شاہد نے کہا۔

"بالکُل دُرست۔ لیکن اُسے پکڑنے میں دُلّا اور رطیفا مدد دے سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" شاہد نے پوچھا۔

"اگر اِن دونوں میں سے کوئی ایک پکڑا گیا تو ہمیں خانو کھرل تک پہنچنے میں آسانی ہوگی" میں نے کہا

"یہ بات تو دُرست ہے۔ اور اگر یہ بات دُرست ہے تو ہمیں سب سے پہلے اُن کو تلاش کرنا ہوگا" شاہد بولا۔

"آپ اُن دونوں کو تلاش کریں' میں خانو کھرل کو ڈھونڈتا ہوں" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے" شاہد نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

خانو کھرل کی فائل میں درج تھا کہ وہ واردات سے پہلے اُس علاقے میں جاتا ہے جہاں واردات کرنا مقصود ہو۔ وہ اُس علاقے کا جُغرافیہ یاد کرتا ہے اور گلیوں اور بازاروں کو ذہن میں رکھتا ہے۔ واردات کے بعد لوگ بتاتے ہیں کہ ایک چھوٹے قد کا' بھینگی آنکھوں والا' آدمی عِلاقے میں گھومتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ اُس کی آواز کرخت ہے اور اُس میں قتل کی دھمکی چھپی ہوتی ہے۔

ایس پی صاحب نے کہا تھا کہ خانو کو زندہ پکڑنا ہوگا' اِس لیے میں نے پستول نہ لیا۔ سوچا' اگر آمنا سامنا ہوا تو اپنے ہاتھوں سے کام لے کر اُس کو بے بس کروں گا۔ میں نے اِس طریقے سے کئی مُجرِم قابو میں کیے تھے اور ہتھکڑی لگا کر اُن کو تھانے لے گیا تھا۔

شاہد ساری رات اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دُلّے اور رطیفے کا پتا معلوم کرتا رہا۔ لیکن اُسے کچھ معلوم نہ ہوا اور وہ دوسرے دن سویرے تھکا ماندہ دفتر آگیا۔ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

"کیا کیا رات بھر؟" میں نے پوچھا۔

"ذلیل و خوار ہُوا۔ ہر کسی سے پوچھا' کسی نے کچھ نہ بتایا" شاہد بے زاری سے بولا۔

"پھر تو ساری محنت اکارت گئی" میں نے اُس سے ہمدردی جتائی۔

"اور کیا۔ لیکن تم نے کیا کیا؟" اُس نے اُلٹا سوال داغا۔

"بس سوچا اور کچھ نہیں کیا" میں نے کہا۔

"تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے تو بہت

دوست ہیں۔ ہر خوانچہ فروش، ریڑھی والا، بھنگی چرسی، چور اُچکّا تمہاری مدد کرتا ہے" وہ مُنہ لٹکا کر بولا۔

"میں بھی تو اُن کے کام آتا ہوں۔ چھوٹے موٹے جُرموں میں، قانون کے مُطابق، اُن کی مدد کرتا ہوں، اور جب مجھے ضرورت پڑے تو وہ میری مدد کرتے ہیں" میں نے کہا۔

شاہد نذیر نے میری پوری بات نہ سُنی اور میز پر سر رکھ کر سوگیا۔

دوسرے دن میں گلی محلّوں میں گھومتا رہا۔ ٹھوکر نیاز بیگ سے شاہدرہ تک چکّر لگایا اور واقف کاروں سے ملا۔ لیکن کسی نے خانو کھرل کو نہ دیکھا تھا۔

میں رات کو مال روڈ کے ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ نہایت قیمتی سُوٹ پہنے ٹھگنے قد کا ایک شخص اندر آیا۔ وضع قطع اور حُلیے سے وہ خانو کھرل نظر آتا تھا۔ وہ کونے کی میز پر بیٹھ گیا۔ لگتا تھا کھانا کھانے آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چار اور آدمی آئے۔ دو انگریزی سُوٹوں میں تھے اور دو دیسی سُوٹوں میں۔ وہ بھی ٹھگنے آدمی کی میز کے اِردگِرد بیٹھ گئے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھگنے قد کا آدمی اُٹھا اور کاؤنٹر پر جاکر للکارا:

"ہینڈز اَپ! ہلنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ میری گولی تمہارا سینہ چیر کر رکھ دے گی"۔

اُس کی آواز میں گولی کی سی کاٹ تھی۔ وہ تو وہیں کھڑا رہا، اُس کے ساتھیوں نے لوگوں کی جیبیں صاف کیں، گھڑیاں اُتاریں، کیشیئر سے رقم لی اور چل دیے۔ میرے پاس نہ رقم تھی نہ گھڑی۔ اِس لیے میں بچ گیا۔

میں نے خانو کھرل، دُلّے اور لیفے کو پہچان لیا تھا۔ البتہ اُن کے دو ساتھی میرے لیے اجنبی تھے۔

پولیس کو اِطلاع ہوگئی تھی اور وہ اُن کا پیچھا کررہی تھی۔ وہ کار میں بھاگے تھے اور مال روڈ سے مزنگ کی طرف گئے تھے۔ وہاں سے شام نگر، شام نگر سے گلشن راوی اور گلشن راوی سے سمن آباد آئے۔ وہاں چودھری کالونی کے راستے اِقبال ٹاؤن پہنچے۔ پولیس اُن کا پیچھا نہ کرسکی۔ البتہ ٹریفک پولیس کے دو موٹر سائیکل سوار جوانوں نے اُن کا تعاقب جاری رکھا۔ اِقبال ٹاؤن میں، فلم اِسٹوڈیو کے پیچھے، ایک گلی میں خانو کھرل کی کار داخل ہوئی۔ یہ بند گلی تھی۔ جب اُس کو معلوم ہوا کہ گلی بند ہے تو اُس نے کار موڑی اور ٹریفک پولیس کے سپاہیوں کو روندتا ہوا نکل گیا۔ ایک سپاہی بچ گیا، دوسرا شدید زخمی ہوا۔ خانو نے کار کھڑی کی، اُس کا پچھلا شیشہ توڑا اور پیچھا کرنے والے سپاہی پر فائرنگ کردی۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

خانو کھرل مزے سے فرار ہوگیا!

فرار ہونے کے بعد وہ دُلّے کے ڈیرے پر، کوٹ عبدُالمالک، پہنچے اور جو سامان لُوٹا تھا، اُسے آپس میں بانٹ لیا۔ لیکن لُوٹ کے مال میں ہیرے کی وہ انگوٹھی نہ تھی جو ایک ہوٹل میں عرب شہزادے کی اُنگلی سے دُلّے نے اُتاری تھی اور خانو نے اُسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

مال کی تقسیم کے بعد خانو نے لیفے سے کہا کہ وہ چند دنوں کے لیے فیصل آباد چلا جائے۔ اُس نے دُلّے سے کہا کہ وہ کوٹ عبدُالمالک کے مکان میں تالا لگا کر اپنی بیوی کے پاس گاؤں چلا جائے۔ دونوں نے ایسا ہی کیا۔ باقی دو لٹیرے لاہور کے تھے۔ وہ رات کو لاہور چلے گئے۔

دس دن بعد خانو نے دُلّے کو بُلوایا اور نئی واردات کے لیے اُسے نقشہ سمجھایا۔ اُسے طے شدہ تاریخ اور وقت کے مُطابق اپنے گھر کے باہر گلی کے درمیان کھڑا ہونا تھا تاکہ جب سفید رنگ کی کار آئے تو وہ اُسے لے کر ماڈل ٹاؤن پہنچ جائے، جہاں اُنہیں واردات کرنی تھی۔

دُلّے کو گلی میں کھڑے ہوئے چند منٹ گزرے تھے کہ سفید کار آئی، جس میں خانو سوار تھا۔ کار دُلّے کو کُچل کر آگے بڑھ گئی اور شاہدرہ موڑ سے ہوتی ہوئی لاہور آگئی۔ خانو نے اُسے "بے ایمانی" کی سزا دے دی تھی۔

اِس کے دوسرے دِن، رات کو، دو ڈاکوؤں نے اقبال ٹاؤن کی ایک بیوہ خاتون، رمضان بی بی، کے گھر ڈاکا ڈالا۔ اُن میں سے ایک کا حُلیہ ٹیفے کا سا تھا۔ جب وہ، لُوٹ کا مال لے کر، جا رہے تھے تو پولیس نے پکڑ لیا۔ ٹیفے نے پولیس کو اپنا نام نُور دین بتایا۔

دوسرے دن مَیں نُور دین سے حوالات میں ملا۔ وہ ٹیفا ہی تھا۔ میں نے تھانیدار سے مل کر رمضان بی بی کو اُس کا مال واپس دِلوایا اور ٹیفے کو چھوڑنے کے لیے کہا۔ اب خانو تک پہنچنے کے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا۔

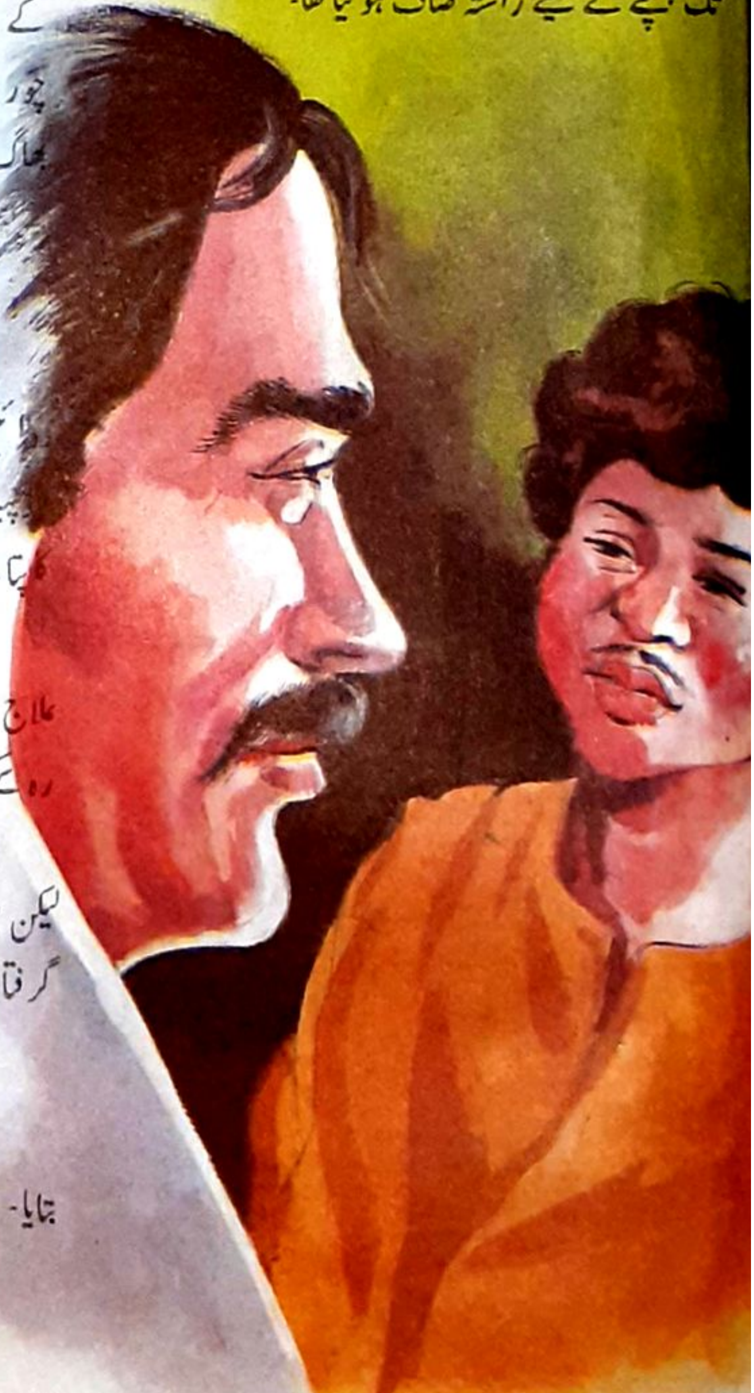

ٹیفے نے حوالات سے نکل کر مجھ سے جو پہلا سوال کیا، وہ تھا "تم کون ہو؟"

"میں واحد وِرک ہوں، نارووال کا زمیندار" میں نے جواب دیا۔

"رمضان بی بی آپ کی کیا لگتی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"وہ رشتے میں میری خالہ ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ مجھے میرا سامان اور رقم مل جائے تو میں لٹیروں کو مُعاف کر دوں گی۔ میں نے سوچا، چلو، نور دین کی مدد کرتے ہیں" میں نے کہا۔

"دراصل میری بیوی بیمار ہے اور مجھے اس کے عِلاج کے لیے 20 ہزار روپوں کی ضرورت ہے۔ اِس لیے ایک چور کے ساتھ مل کر میں نے رمضان بی بی کو لُوٹا۔ وہ تو بھاگ گیا، میں پکڑا گیا"۔

"بیوی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ہسپتال میں ہے" ٹیفے نے بتایا۔

ہم دونوں ہسپتال گئے۔ ڈاکٹر سے ملے۔ نُسخہ لیا۔ پھر دوائیں خریدیں۔ کمرے کا کرایہ دیا۔ کُل چھ سات ہزار روپیہ خرچ ہوا جو میں نے ادا کیا اور پھر نُور دین سے اُس کا پتا لے کر اُسے رُخصت کیا۔

اگلے دن میں ڈاکٹر سے ملا۔ اُس نے کہا کہ اگر دُرست علاج نہ ہوا تو نور دین کی بیوی مُشکِل سے ایک سال زندہ رہ سکے گی۔ اُسے سرطان ہو گیا ہے۔

پولیس خانُو کو پکڑنے میں بُری طرح ناکام رہی تھی لیکن میں نے ایس پی تیمُور نکّا کو بتایا کہ چند دنوں تک خانو گرفتار ہو جائے گا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" ایس پی صاحب نے پوچھا۔

"میرا رابطہ ہُوا ہے اُس کے ساتھی سے" میں نے بتایا۔

"کون سا ساتھی؟" انھوں نے پوچھا۔

"اُس کا نام ٹیفا ہے اور وہ چونڈہ کے پاس ایک گاؤں میں رہتا ہے" میں نے بتایا۔

"اب کہاں ہے وہ؟" ایس پی صاحب نے پوچھا۔

"اپنے گاؤں میں۔ اُس کی بیوی بیمار ہے۔ وہ اُسے لاہور لایا تھا۔ دوائیں لے کر گاؤں گیا ہے، لیکن ممکن ہے لاہور آگیا ہو" میں نے کہا۔

"اُس کی مالی حالت آج کل کیسی ہے؟" ایس پی صاحب نے سوال کیا۔

"خراب، بہت خراب۔ میرا قرض دار ہے" میں نے بتایا۔

"کتنی رقم دی ہے تم نے اُسے؟" ایس پی صاحب نے پوچھا۔

"سات ہزار روپے" میں نے کہا۔

"وہ اب لاہور آگیا ہوگا" ایس پی صاحب نے کہا۔

اُن کا اندازہ دُرست تھا۔ لاہور میں ڈاکا زنی اور لوٹ مار کی وارداتیں عام ہوگئیں۔ پولیس مشکل میں پھنس گئی۔ اخبارات نے پولیس کے خلاف لکھنا شروع کردیا۔

میں ایک بار پھر اُسی تھانیدار کے پاس گیا جس نے لیفے کو چوری کے الزام میں پکڑا تھا اور میں نے اُسے چھڑایا تھا۔ میں نے اُسے لیفے کا پتا دیا اور کہا کہ وہ چھاپا مار کر اُسی مُقدّمے میں لیفے کو پکڑے اور حوالات میں بند کردے، کیوں کہ خانو کھرل کو پکڑنے کے لیے مجھے لیفے کی ضرورت ہے۔ تھانیدار مان گیا۔ چُناں چہ اُس کے سپاہیوں کو لے کر شاہد نذیر چونڈہ گیا اور دوسرے دن لیفے کو پکڑ کر حوالات میں بند کردیا۔ جب میں اُس سے ملا تو اُس نے پھر وہی سوال کیا:

"تم کون ہو؟"

"میں واحد ورک ہوں، اِنسپکٹر سی آئی اے لاہور" میں نے کہا۔

وہ چونک پڑا۔ بولا "آپ نے پہلے بتایا تھا کہ آپ نارووال کے زمیندار ہیں"۔

"ہاں۔ میں نے دُرست بتایا تھا اور اب بھی درست بتا رہا ہوں"۔

"مجھے دوبارہ کیوں پکڑا گیا ہے؟"

"میں تم سے ملنا چاہتا تھا"۔

"آپ میرے گاؤں آجاتے"۔

"مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ تم گاؤں میں ہوگے یا خانو کے پاس"۔

"تو آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں"۔

"جی ہاں"۔

"کیا چاہتے ہیں آپ مُجھ سے؟"

"خانو سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"یہ ناممکن ہے"۔

"اگر ناممکن ہے تو ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اِعتراض نہیں۔ تم کم از کم پندرہ سال جیل کی ہَوا کھاؤ گے، کیوں کہ اِس ڈاکے کے عِلاوہ تم نے اور بھی کئی وارداتیں کی ہیں"۔

"پھر کیا ہُوا؟ مجھے میرے کِیے کی سزا ملنی چاہیے" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"تمھارے ساتھ تمھاری بیوی کو بھی سزا ملے گی۔ وہ کینسر کی مریضہ ہے۔ ایک سال کے اندر ختم ہو جائے گی"۔

لیفا گردن اُٹھا کر باتیں کر رہا تھا۔ اب سرنیچا کرکے خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد بولا "میں تیار ہوں۔ خانو لاہور میں ہے۔ لیکن وہ لاہور چھوڑنا چاہتا ہے۔ یہاں اب پولیس چوکنّی ہوگئی ہے۔ گشت بڑھا دی گئی ہے۔ ناکے زیادہ ہوگئے ہیں۔ پولیس افسر اُسے پکڑنے کے لیے دن رات دوڑ دھوپ کررہے ہیں۔ اِس لیے وہ اِنڈین بارڈر کے قریب کسی چھوٹے سے پاکستانی گاؤں میں رہنا چاہتا ہے۔ اُس نے ضلع نارووال میں تحصیل شکرگڑھ کے ایک گاؤں نرگال کا نام لیا تھا"۔

"میں اُس گاؤں کو جانتا ہوں۔ یہ اِنڈیا اور پاکستان کی سرحد پر، تھانہ کوٹ نیناں میں، پاکستان کا آخری گاؤں ہے" میں نے کہا۔

"اِس گاؤں میں اُس کا ایک دوست ہاشم علی اِسمگلر رہتا ہے۔ وہ اُس کی حویلی میں ہوگا" لیفے نے بتایا۔

میں نے سفید پتلون، سفید قمیص اور کالے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر ہیٹ تھا۔ ہاتھوں میں مچھلی پکڑنے کی بنسیاں تھیں اور میں ایک کانسٹیبل کے ساتھ اِنڈین بارڈر کے پاس، نرگال گاؤں کے مچھلی فارم کے کنارے بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ ہمارا تانگہ دور ایک درخت تلے کھڑا تھا۔ اُس سے پرے، جھاڑی کے پیچھے، طیفا چُھپا بیٹھا تھا۔ میرا پستول اُس کے پاس تھا۔

میں کبھی کبھی، نظریں چُرا کر، ہاشم علی کی حویلی کی طرف دیکھ لیتا تھا، جس کے ایک کمرے میں خانو رہتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ خانو تک کیوں کر پہنچ سکوں گا کہ اچانک ہاشم علی کا نوکر حویلی سے نکلا اور ڈگ بھرتا ہُوا میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

"یہاں مچھلیاں پکڑنا منع ہے" اُس نے کرخت آواز میں کہا۔

"میرے پاس مچھلیاں پکڑنے کا لائسنس ہے" میں نے انگریزی میں لکھا ہوا لائسنس اُسے دکھایا۔

"مجھے نہ انگریزی آتی ہے اور نہ اُردو" وہ بولا۔

"چودھری ہاشم علی کو آتی ہوگی" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ویسے وہ ٹریکٹر لینے لاہور گیا ہے" یہ کہہ کر اُس نے لائسنس پکڑا اور اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر بولا "چودھری صاحب کا مہمان انگریزی جانتا ہوگا۔ آؤ، اُس کو دکھاتے ہیں"۔

وہ آگے آگے اور اُس کے پیچھے میں چل پڑا۔ میرے پیچھے میرا ساتھی کانسٹیبل تھا۔ حویلی کے صحن میں ایک چارپائی پر خانو بیٹھا تھا۔ اُس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں چپّل تھی۔ سُورج میرے پیچھے تھا اور اُس کی کِرنیں خانُو کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ ہمیں گھور رہا تھا۔ لیکن سورج کی کِرنوں کی وجہ سے پریشان تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔

"صاحب، یہ لائسنس پڑھو" نوکر نے اُس سے کہا۔

پستول چارپائی پر رکھ کر خانُو نے لائسنس لیا۔ اُسی لمحے میں نے نوکر کو دھکّا دیا اور خانُو کے دونوں بازو جکڑ کر اُسے قابُو میں کرلیا۔

کانسٹیبل نے جلدی سے ہتھکڑی نکالی اور اُس کے دونوں ہاتھوں میں پہنادی۔ اِس طرح ایک نہایت خطرناک ڈاکو پکڑا گیا، جسے زندہ یا مُردہ پکڑنے یا پکڑوانے کے لِیے حکومت نے 5 لاکھ روپے کا اِنعام مُقرّر کیا تھا۔

ایک ماہ کے اندر اندر طیفے کو پانچ لاکھ رُوپے کا اِنعام مل گیا، جو ظاہر ہے میں نے ہی اُسے دِلوایا تھا۔ اُس نے اِس رقم میں سے میرا قرضہ ادا کیا اور باقی سے اپنی بیوی کا عِلاج کیا۔ اب وہ شریفانہ زندگی بسر کررہا تھا اور اُس نے گناہوں سے توبہ کرلی تھی۔

خانو پر مُقدّمہ چلا اور ایک سال بعد اُس کو پھانسی دے دی گئی!

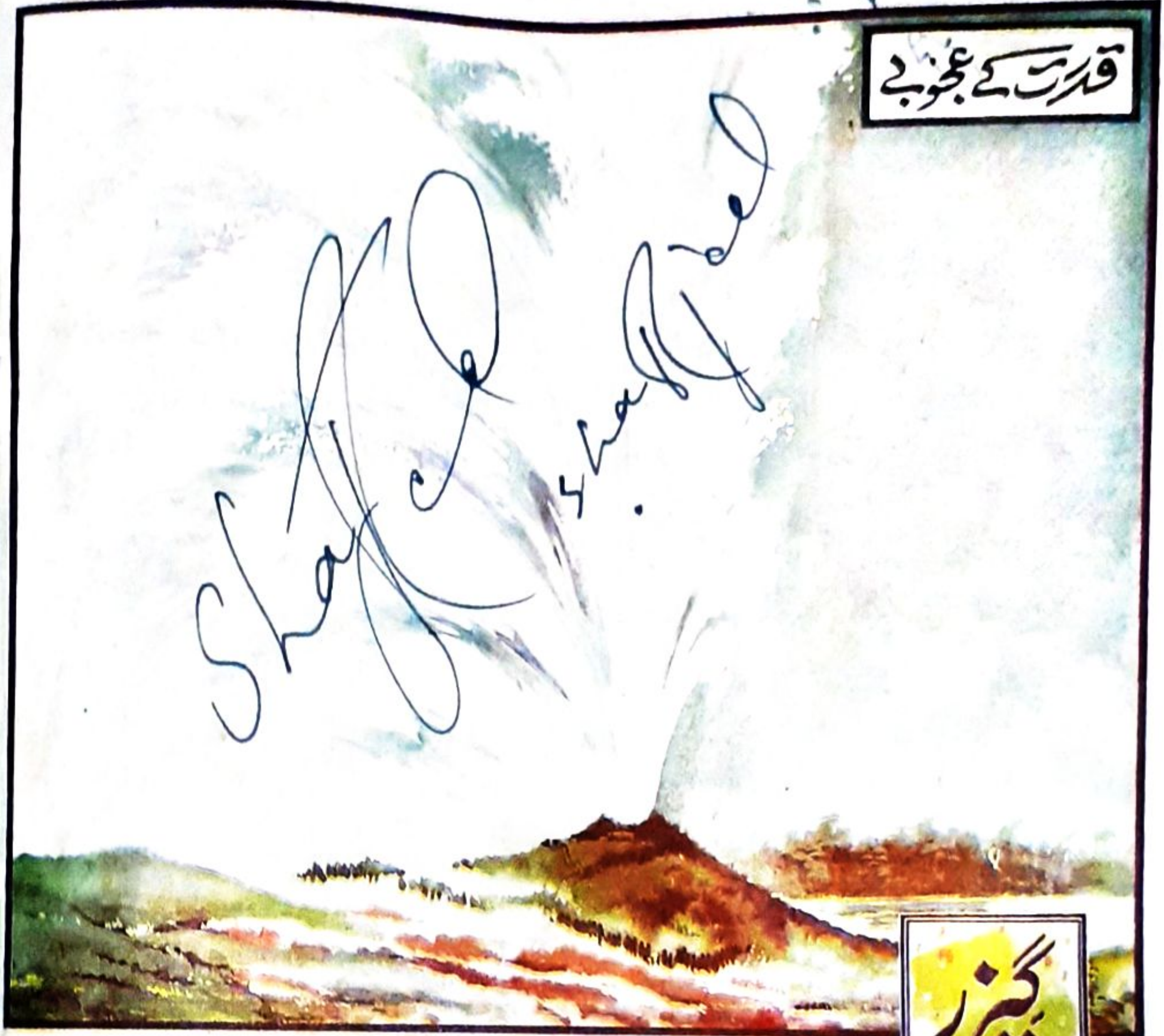

قدرت کے عجوبے

گیزر

امریکا کی ایک پہاڑی ریاست، وایومنگ، میں ایک بہت خوب صورت پارک ہے، جسے "یلو اسٹون نیشنل پارک" کہتے ہیں۔ اِس پارک میں سب سے مشہور اور قابلِ دید چیز ایک گیزر (Geyser) یعنی گرم پانی کا چشمہ ہے، جسے اولڈ فیتھ فُل کہتے ہیں۔

اِس گیزر میں سے، ہر 65 مِنٹ بعد، گرم گیس کے ساتھ پانی کی موٹی سی دھار نکلتی ہے جو آہستہ آہستہ اُونچی ہوتی جاتی ہے اور دو تین مِنٹ بعد 150 فُٹ تک بلند ہو جاتی ہے۔ پانچ منٹ بعد اِس کی بلندی کم ہونے لگتی ہے، اور پھر کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

گیزر گرم پانی کے چشمے ہوتے ہیں، اور اُن علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں کبھی آتش فشاں پہاڑ ہوتے تھے۔ یہاں، زمین کی سطح کے نیچے، پگھلی ہوئی چٹان (میگ ما) ہوتی ہے۔ اِس چٹان کی حرارت سے پانی گیس بنتا رہتا ہے اور جب گیس کا دباؤ بڑھتا ہے تو وہ پھوٹ پڑتی ہے، اور اُس کے ساتھ گرم پانی کی دھار بھی نکلتی ہے۔

اِس قسم کے گیزر آئس لینڈ، نیوزی لینڈ، وسطی امریکا اور ملائیشیا میں بھی ہیں، لیکن اِن کی گیس اور پانی کی دھار نکلنے کا کوئی وقت مُقرّر نہیں ہے۔ یہ خوبی یلو اسٹون نیشنل پارک کے اِس گیزر ہی میں ہے۔ اِس لیے لوگ اِسے Old Faithful یعنی وفادار یا قابلِ اعتبار بوڑھا کہتے ہیں۔

R. No. 4756
The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF A

ILLUSTRATED
FS
CLASSICS

ILLUSTRATED CLASSICS

السٹریٹڈ کلاسکس

فیروز سنز نے پہلی بار ایسے تصویری کلاسکس کا دلچسپ سلسلہ شروع کیا ہے جس میں رنگا رنگ تصویروں کے ذریعے نامور ہیروز HEROES کے کارنامے پیش کیے جاتے ہیں۔ بچے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی مزیدار فلم دیکھ رہے ہوں۔ بچوں کے علاوہ بڑے بھی ان تصویری کلاسیکوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

محمّد بن قاسم ★ ٹیپو سلطان ★ شیر شاہ سوری

یہ تینوں کلاسکس چھپ چکے ہیں

اس کے علاوہ دوسرے ہیروز HEROES پر کام ہو رہا ہے۔

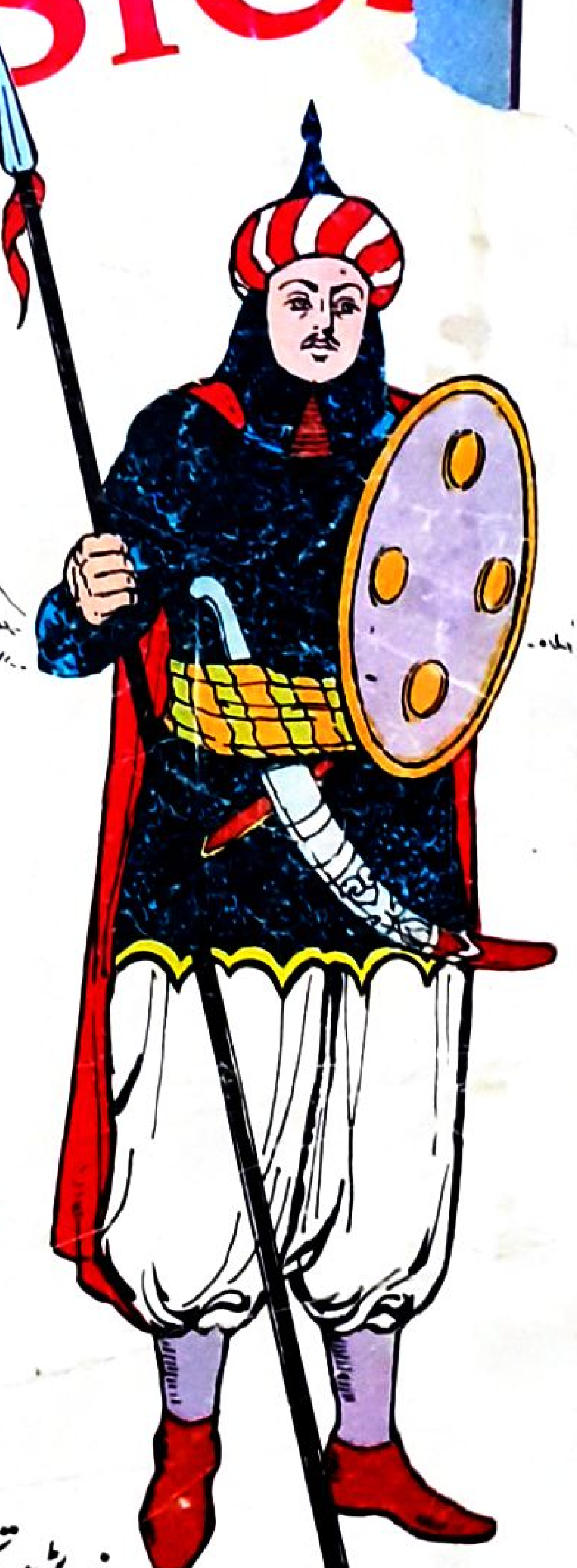

خود پڑھیے تحفہ میں دیجیے

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
کراچی
راولپنڈی